اڑن طشتری



اُڑن طشتری

بچّوں کے لیے ناول

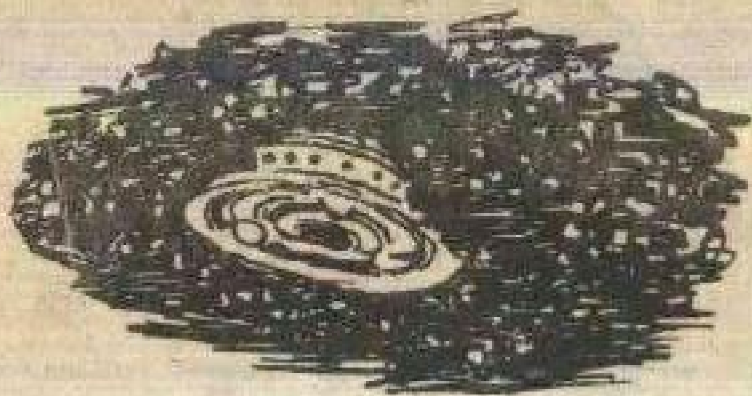
رونیلڈ ڈیڈمین

رحیم



فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور - راولپنڈی - کراچی



اختر نے دیکھ لیا

اختر بڑا ذہین اور پیارا لڑکا تھا۔ وہ ایک گاؤں میں رہتا تھا جو پہاڑ کے دامن میں آباد تھا۔ اس کے ایک طرف ہرے بھرے کھیت لہلہاتے تھے، جن کے پرے گھنے جنگل تھے اور دوسری طرف ایک ندی بہتی تھی جس میں ڈھیروں مچھلیاں تھیں اور مچھیروں نے یہاں اپنی جھونپڑیاں بنا رکھی تھیں۔

شام ہو رہی تھی اور دور، جہاں زمین اور آسمان ملتے نظر آتے ہیں، سورج سرخ تھال بنا ہوا ہوا میں لٹکتا دکھائی

دیتا تھا۔ پرندے گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے۔ مُرغیاں چُوزوں کو پروں تلے سمیٹے اپنے ٹھکانوں پر آ گئی تھیں۔ شاہو چودھری کے کھیت میں گائے ہلکے ہلکے ڈکرا رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو "لو بھئی دن کا کام کاج ہو چُکا۔ اب سو رہو۔"

گرمیوں کی رات تھی۔ اختر اپنے چوبارے میں سونے کی تیّاری کر رہا تھا۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ اگر، سہج سہج، سات بار سر کو تکیے پر ماریں تو بڑے سُہانے خواب دِکھائی دیتے ہیں۔ ابھی اُس نے ساتویں بار سر مارا تھا کہ اُس کی آنکھیں مُند گئیں اور وُہ خواب دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ ایک شخص اُس سے کہہ رہا ہے۔ "کیوں میاں، تیّار ہو؟"

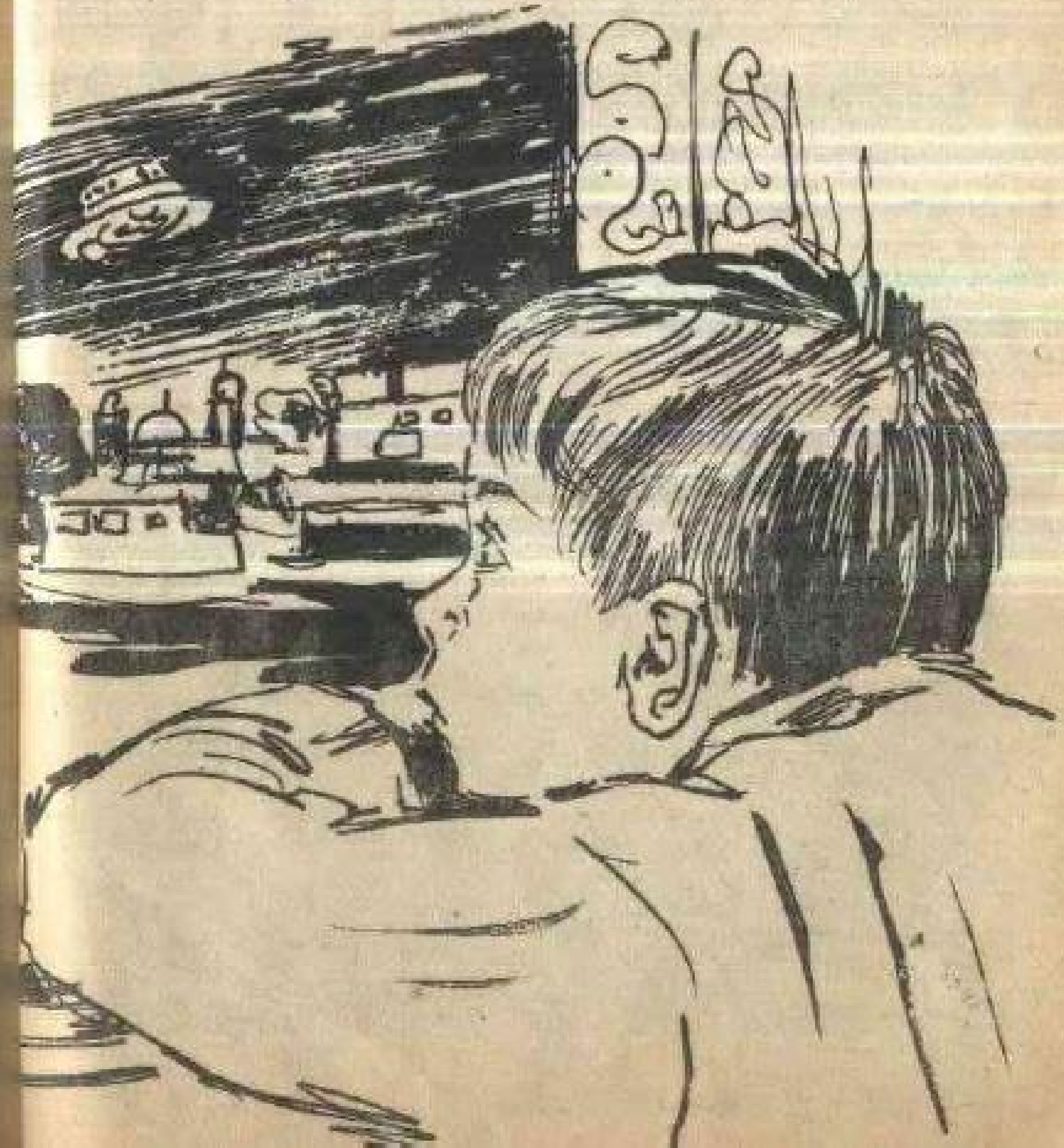
اور اس کے ساتھ ہی ایک باورچی آیا اور اُس نے دسترخوان پر ایسے ایسے مزے دار

کھانے چُن دِیئے کہ اختر کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔

اُس نے حلوے کی پلیٹ اپنی طرف سرکائی ہی تھی کہ ایک دم اُس کی آنکھ کُھل گئی اور آسمان پر ایک بے حد چمکیلی چیز نے اُس کی آنکھوں کو چوندھیا دِیا۔ اِتنا مزے دار حلوا اُس کے مُنہ میں آتے آتے رہ گیا، اِس کا اِسے افسوس تھا۔ مگر آسمان والی چمکیلی چیز دیکھ کر وُہ سب کچھ بھول گیا اور کھڑکی میں سے، ٹکٹکی باندھ کر، اسے دیکھنے لگا۔

قصبے کے لوگ کچھ جاگتے اور کچھ سوتے تھے۔ اُنھوں نے بھی ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ اور کوشش کے بعد بھی جب معلُوم نہ ہو سکا کہ یہ کیا چیز ہے تو بڑبڑاتے ہُوئے پھر سو گئے۔

مگر اختر برابر دیکھتا رہا۔ اسے آسمان میں شمالی سِتارہ بھی جگمگ جگمگ کرتا نظر آ رہا تھا اور روشن چاند بھی جو کبھی کبھار بادلوں میں چھپ جاتا تھا۔ اُس نے کُتّے



کے بھونکنے کی آواز بھی سُنی اور اُلّو کی آواز بھی جو جنگل میں بول رہا تھا۔

اُس نے دِل میں کہا ہو سکتا ہے یہ سب کچُھ خواب ہی ہو۔ میں حلوا بھی تو خواب ہی میں کھانے لگا تھا۔ یہ سوچ کر اُس نے اپنی ناک کو زور زور سے مسلا۔ جب درد محسُوس ہُوا تو کہنے لگا "نہیں نہیں یہ خواب ہرگز نہیں ہو سکتا میں سب کچُھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہُوں اور دُوسرے لوگ بھی یہی کچُھ دیکھ رہے ہوں گے۔ اب صُبح ہی پتا چلے گا کہ اصل ماجرا کیا ہے۔"

یہ سوچتے ہُوئے اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو گئیں اور وُہ کھڑکی سے ہٹ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ شاید وُہ پھر کوئی خواب دیکھ رہا تھا مگر ہر بار خواب میں حلوا کہاں؟

زمین پر اُترنا

اختر تھوڑی ہی دیر سویا تھا کہ پھر اُس کی آنکھ کھُل گئی اور وُہ کھڑکی کے پاس آ کر اِس چیز کو دیکھنے لگا جس نے اُسے آرام سے سونے بھی نہیں دیا تھا۔

وُہ چیز ایک بہُت بڑی چاندی ایسی دھات کی بنی ہُوئی طشتری یا رکابی تھی۔ اس کے کناروں پر چھوٹی چھوٹی ٹونٹیاں لگی ہُوئی تھیں۔ اِن ٹونٹیوں سے تیز تیز شعلے لپک لپک کر باہر آ رہے تھے اور اُس کی دُم سے ایک بہُت بڑا سُرخ شعلہ دُور تک فضا میں لہراتا دِکھائی دیتا تھا۔ اگر اگلے وقتوں کے لوگ اِسے دیکھ لیتے تو وُہ یہی کہتے کہ یہ تو اُڑن ناگ

ہے۔

اِس کے اُوپر ایک گول کمرہ بنا ہُوا تھا جس کی شکل اوندھے ٹوکرے سے ملتی جُلتی تھی۔ اس میں برابر برابر فاصلے پر دس کھڑکیاں لگی ہُوئی تھیں جن میں سے روشنی پھُوٹ پھُوٹ کر نکل رہی تھی۔ اُڑن طشتری تین دفعہ بجلی کی طرح گھن گرج کے ساتھ ہَوا میں گھُومی جیسے زمین پر اُترنے کے لیے جگہ تلاش کر رہی ہو۔

وُہ تھوڑی دیر ہوا میں لٹکی رہی اور پھر اُس میں سے ایک چمکتی ہُوئی سیڑھی لٹکائی گئی جو سیدھی زمین سے لگ گئی اور پلک جھپکتے میں اِس پر سے ایک چھوٹا سا لڑکا اُترتا دِکھائی دیا۔

اس لڑکے نے عجیب سا لباس پہن رکھا تھا۔ زمین پر اُترتے ہی اُس نے تین دفعہ زور زور سے ہوا میں بازو لہرائے

اور پھر درختوں کے سائے میں غائب ہو گیا اِدھر وُہ غائب ہُوا اور اُدھر اُڑن طشتری میں سے تین زور دار شُعلے لپکے اور پھر وُہ مشرق کی جانب تیزی کے ساتھ روانہ ہو گئی۔

اِس کے بعد ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں۔ اختر کھڑکی سے ہٹ کر اپنی چارپائی پر آیا اور یہ کہتے کہتے گہری نیند سو گیا "توبہ توبہ! مُجھے تو یہ جادُو کا کھیل معلُوم ہوتا ہے۔ بالکُل جادُو کا کھیل!"

پنچایت

گاؤں کے لوگ بڑے محنتی تھے۔ کام کاج جی لگا کر کرتے تھے۔ وُہ صُبح سویرے کھیتوں میں چلے جاتے تھے اور سُورج ڈُوبنے کے وقت گھروں کو لوٹتے تھے۔ تمام دِن کام کرتے کرتے کمر دوہری ہو جاتی تھی اور جب رات کے وقت بِستر پر پڑتے تھے تو ایسے بے سُدھ ہو کر سوتے تھے کہ کسی چیز کا ہوش نہ رہتا تھا۔

لیکن اِن نیند کے ماتوں کی آبادی میں کم سے کم دو شخص ایسے ضرور تھے جنھوں نے رات کو نہ سونے کی قسم کھا رکھی۔ اور وُہ تھے ساجا اور ماجا۔ وہ گاؤں

کے چوکیدار تھے جو دِن کو سوتے تھے اور رات کو پہرا دِیا کرتے تھے کہ گاؤں میں چور اُچکے نہ گھس آئیں۔

آج رات جب ماجے نے اُڑن طشتری دیکھی تو وُہ بھونچکا سا رہ گیا۔ دوڑتا ہُوا ساجے کے پاس گیا اور بولا۔ "بھئی ساجے، وُہ دیکھو اُدھر، آسمان پر۔ میری اتنی عُمر ہو گئی پر ایسی چمک دار اور تیزی سے گھومنے والی چیز میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ یہ قیامت کی نشانیاں ہیں قیامت کی۔"

ساجے نے کہا۔ "ہاں بھائی، زمانہ بھی تو دیکھو کون سا جاتا ہے۔ اِس زمانے میں جو بھی ہو تھوڑا ہے۔ توبہ توبہ، تم سچ کہتے ہو۔ یہ قیامت ہی کی نشانیاں ہیں۔"

ماجے نے کہا "میرا خیال ہے، ہم

صُبح سویرے شاہُو چوہدری کے ڈیرے چلیں اور اُسے ساری بات بتائیں۔ وہ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ کچھ نہ کچھ تو بتائے گا۔"

"ہاں ہاں۔ ضرور چلیں گے۔ تم نو بجے وہاں پہنچ جانا۔ میں بھی ٹھیک وقت پر آجاؤں گا۔"

دُوسرے روز صُبح نو بجے ماجا اور ساجا شاہُو چودھری کے ڈیرے پر گئے۔ ماجا اُڑن طشتری کی بات بتانے کے بعد بولا "کیوں چودھری جی، یہ شیطان کے کھیل ہیں نا؟"

"ارے پگلے، شیطان کا اِس سے کیا کام۔ وُہ کوئی اُڑن طشتری ہو گی۔ میں نے اخباروں میں اس کے بارے میں پڑھا ہے۔" چودھری نے سر ہلاتے ہُوئے کہا۔

"چودھری جی، آپ نے میرے دل

کی بات کہہ دی ۔ مگر اُڑن طشتریوں کے ساتھ سیڑھیاں بھی لٹکا کرتی ہیں کیا؟ اور اُن سے سُنہری سُوٹ پہنے ہُوئے بُھتنے بھی اُترتے ہیں زمین پر ؟" ساجے نے ڈرتے ڈرتے پُوچھا ۔

"تُم کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہے تھے ؟"

"نہیں چودھری جی ، بالکل نہیں ۔" ماجا بولا ۔ "ہم نے اپنی آنکھوں سے ایک بُھتنا اُترتے دیکھا تھا اور جس سیڑھی سے وُہ اُترا تھا وُہ چاندی کی طرح چمک رہی تھی ۔"

ساجے نے کہا "چودھری جی ، ماجا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے ۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ۔"

شاہو چودھری چوکیداروں کی باتیں سُن کر بہُت حیران ہُوا اور کہنے لگا "میرے

خیال میں گاؤں کے بڑے بُوڑھوں کو بھی بُلا لیا جائے ۔ تُم اُن کو اپنی کہانی سُنانا شاید وُہ کوئی بات بتا سکیں ۔"

ماجا ساجا دوڑ کر گاؤں کے بڑے بُوڑھوں کو بُلا لائے اور جب وُہ جمع ہو گئے تو ماجے اور ساجے نے اُن کے سامنے اپنی کہانی دُہرائی جسے سُن کر حکیم صاحب کہنے لگے :

"چودھری صاحب ، جب آدمی رات کو زیادہ کھانا کھا لے تو اُسے بد ہضمی ہو جاتی ہے اور اُسے بڑے ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے ساجے اور ماجے نے کل رات کھانا زیادہ کھا لیا تھا ، پہرا دیتے دیتے ان کی آنکھ لگ گئی اور وہ لگے اُوٹ پٹانگ خواب دیکھنے ۔"

حکیم صاحب کچھ اور کہنا چاہتے تھے

کہ اختر کے دادا چمک کر بولے:

"حکیم صاحب، جو باتیں ساجے ماجے نے کہی ہیں، بالکل وہی میرے پوتے اختر نے مجھے بتائی ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سب کا خواب ایک سا ہی ہو۔"

پھر وہ شاہو چودھری کی طرف دیکھ کر کہنے لگے "چودھری صاحب، اپنے حکیم صاحب تو نرے حکیم صاحب ہی ہیں۔ انھیں جو بھی بات سُنائی جائے گی، وہ اُسے ہیر پھیر کر بدہضمی کا نام دے دیں گے۔ اُنھیں کیا معلوم کہ سائنس کس قدر ترقّی کر چُکی ہے۔ یہ کل ہی کی بات ہے کہ امریکہ کے خلاباز چاند تک کی سیر کر آئے ہیں۔ اِس لیے میرا خیال ہے کہ اِس معاملے کے سچ اور جھوٹ کو پرکھنے کے لیے ہمیں دو تین روز انتظار کرنا چاہیے۔ اِس دوران میں

اخبارات بھی کچھ نہ کچھ لکھیں گے اور جن دوسرے لوگوں نے اِسے دیکھا ہے اُن کی باتیں بھی ہم تک پہنچ جائیں گی۔"

ان جانی دُنیا کے مُسافر

اُڑن طشتری میں تین آدمی بیٹھے ہُوئے تھے۔ وُہ سب چھ فٹ لمبے تھے اور اُنھوں نے خلابازوں کی طرح چُست سُنہری سُوٹ پہن رکھے تھے۔

اُن کی صاف شفّاف آنکھوں سے شوخی ٹپکتی تھی اور اُنھیں دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ یہ لوگ اپنی آنکھوں سے دُوسرے لوگوں کے خیال فوراً تاڑ سکتے ہیں۔

ان کے سر کے بال چاندی کی طرح سُفید تھے مگر یہ سُفیدی بُوڑھوں کے سروں کی سُفیدی نہیں تھی۔ اِس سُفیدی میں خوش نُمائی کی جھلک تھی اور معلُوم ہوتا تھا کہ اِن خُوب صُورت سُفید بالوں

کے نیچے بڑے روشن اور تیز دماغ کام کر رہے ہیں۔

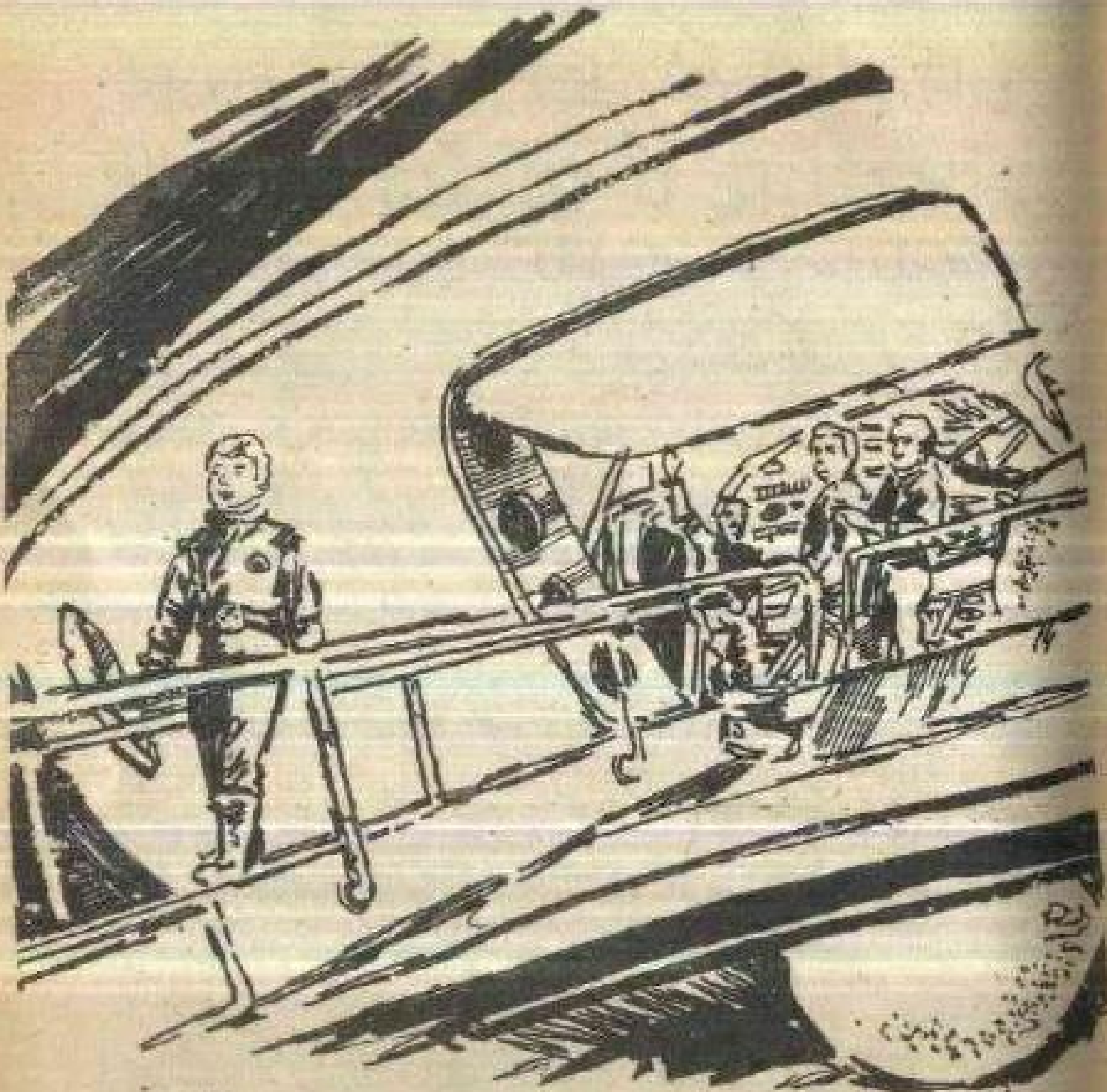
اِن کی اُنگلیاں پتلی، لمبی اور نازُک تھیں اور اُن میں یہ صِفت تھی کہ کِسی چیز کو چھُوتے ہی اس کا سارا حال جان لیتی تھیں۔

ان کے چہروں پر سکُون تھا اور انھیں دیکھ کر یُوں معلُوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ ہماری زمین کے لوگ نہیں بلکہ کِسی اَن جانی دُنیا کے باشندے ہیں۔

اصل میں بات یہ ہے کہ یہ لوگ جِس سیّارے میں بستے تھے وُہ ہماری زمین سے کروڑوں میل دُور ہے۔ وہاں کے رہنے والوں نے سیّاحوں کی ایک جماعت تیّار کی تھی جسے دُوسرے سیّاروں میں جانے کی تربیت دی جاتی تھی۔ اِس سیّارے کے لوگوں کو ہماری زمین کے

حالات جاننے کا بہُت شوق تھا۔ اِس لیے وُہ اپنے سائنس کے آلوں کے ذریعے ہمارے ریڈیو سُنتے اور ٹیلی ویژن دیکھتے تھے۔ یوُں اُنھیں اِس سیّارے کا، جسے زمین کہتے ہیں، تھوڑا بہُت عِلم ہو گیا تھا اور اب وُہ اپنی آنکھوں سے ہمیں اور ہماری زمین کو دیکھنے آئے تھے۔ اِن کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اور ہوتا بھی کیوں؟ جب کوئی دوستی، امن اور پیار کا پیغام لے کر آئے تو اُسے ہتھیاروں سے کیا مطلب؟

ننھّا بڑے سکون کے ساتھ سیڑھی سے اُترا اور کِسی قِسم کی گھبراہٹ کے بغیر اپنے پاؤں زمین پر ٹیک دیے۔ پھر اُڑن طشتری والوں کو ہاتھ ہِلا کر خُدا حافظ کہا۔ اُنھوں نے تین بار سبز بتّیاں روشن کیں اور بُجھا دیں۔ جیسے وُہ بھی ننھّے کو خُدا حافظ



کہہ رہے ہوں۔ پھر ایک سُرخ بتّی ٹمٹما کر بُجھ گئی جس کا مطلب تھا کہ ہم ۲۴ گھنٹے بعد تمھیں لینے آئیں گے۔ سفید بالوں والے ڈرائیور نے ایک بٹن دبایا جس سے ایک زبردست گونج پیدا ہوئی۔ پھر اُڑن طشتری کے

کناروں سے نیلے شعلے لپکے اور وہ شاں شاں کرتی ہوئی بجلی کی تیزی کے ساتھ مشرق کی سمت روانہ ہو گئی۔ راستے میں ڈرائیور اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا "اللہ کرے ننّھا خیریت سے لوٹے۔ لاکھ سیانا سہی، آخر بچّہ ہی ہے نا۔"

اس کے ایک ساتھی نے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ آپ کا بیٹا بڑا ہونہار ہے۔ ہمیں زمین والوں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے مگر جب وہ واپس آ کر ہمیں بتائے گا کہ وہاں کے اِنسان کیسے ہوتے ہیں، کیسے رہتے سہتے ہیں اور ان کی عادتیں کیسی ہیں تو اس سے ہمیں بہت فائدہ ہو گا اور ہم اُن سے دوستی کی بات چیت کریں گے۔"

زمین پر

ننّھا سیڑھی سے اُترتے ہی بھاگ کر جنگل میں جا چھپا اور تاروں بھرے آسمان کو تکنے لگا۔ بے چارہ اکیلا تھا، تن تنہا۔ وہ جہاں اُترا تھا وہ اَن جانی اور اَن دیکھی جگہ تھی۔ اس لیے اُس کا ڈرنا اچنبھے کی بات نہ تھی "لیکن خوف سے تو آدمی بُزدل ہو جاتا ہے۔" اس نے دِل میں کہا "اور بُزدل کسی مُشکل کو حل نہیں کر سکتا۔ میں بھلا کیوں بُزدِل ہونے لگا۔ میں تو بہادر ہُوں، بہادر۔"

اُڑن طشتری کہیں کی کہیں جا پہنچی تھی اور اب دُور، آسمان کی بلندیوں پہ ایک دھبّا سا نظر آ رہا تھا۔ چاروں

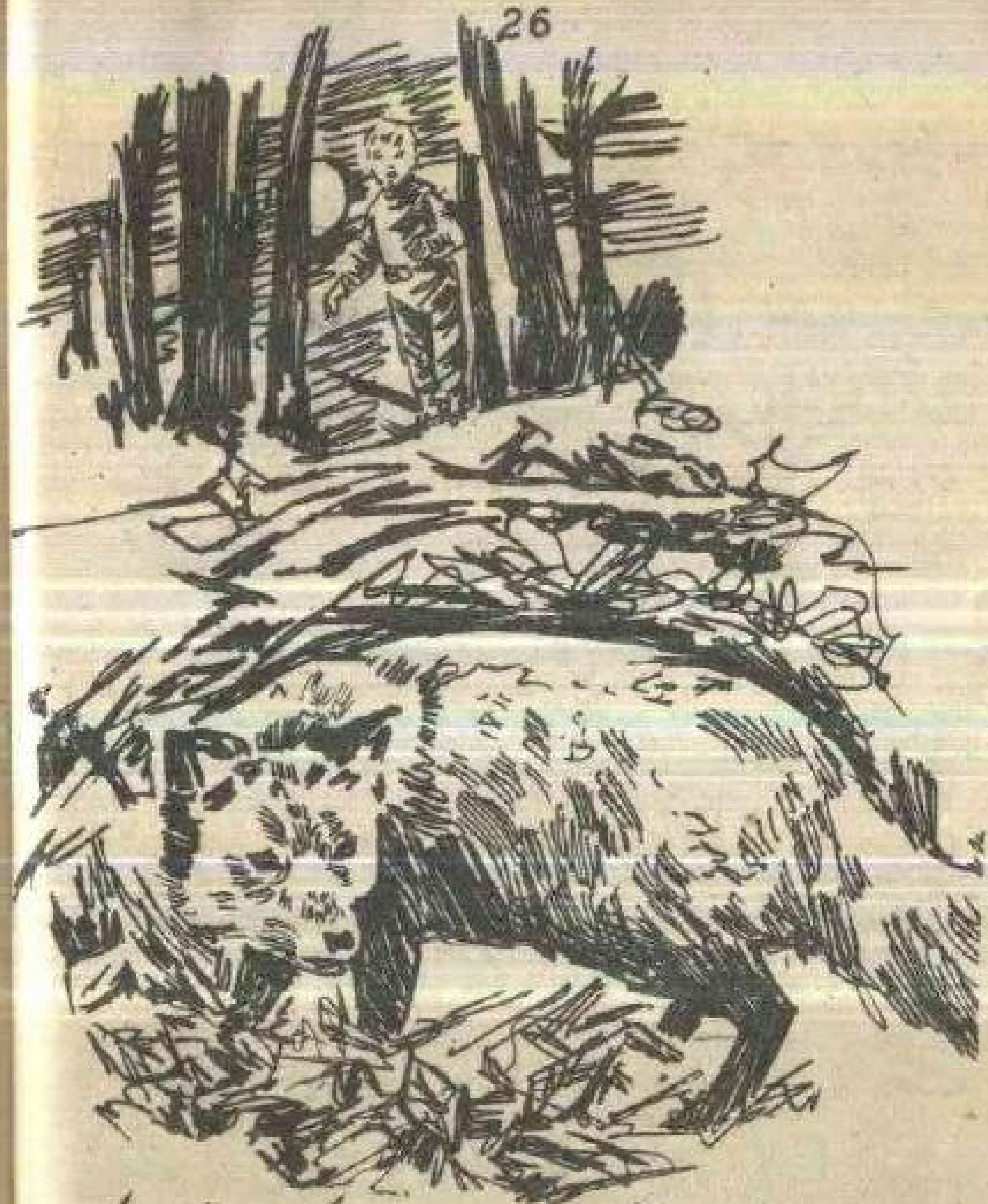
طرف اندھیرا چھایا ہُوا تھا اور تاروں کی مدّھم روشنی میں اِتنی سکت نہ تھی کہ اس اندھیرے کو کم کر سکتی ۔ رہا چاند ، تو وُہ بار بار بادلوں کے پیچھے چُھپ جاتا تھا ۔

ننھّے کو ہر طرف لمبے لمبے سائے نظر آ رہے تھے ۔ اور جن چیزوں کے یہ سائے تھے وُہ چھُونے میں سخت تھیں ۔ اُس نے سوچا تو فوراً خیال آ گیا کہ یہ تو پیڑ ہیں ۔ اور پیڑ تو بے ضرر سی چیز ہیں ۔ بھلا اِن سے کیوں ڈروں ؟

تھوڑی دیر بعد وُہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک ٹہنی پر کوئی مٹیالے رنگ کی چھوٹی سی چیز بیٹھی ہُوئی ہے ۔ اس کی آنکھیں بہُت کم جھپکتی تھیں اور اس کی چونچ مُڑی ہُوئی اور تیز تھی ۔ وُہ چیز زور زور سے کہہ رہی تھی "ہُو ہُو ۔ ہُو ہُو ۔"

یہ کہیں وہی پرندہ تو نہیں جو صرف رات کو شکار کے لیے نکلا کرتا ہے اور جس کا من بھاتا کھاجا ایک لمبی دُم اور چار ننھّے ننھّے پاؤں والی مخلُوق ہے ۔ جسے زمین والے چوہیا کہتے ہیں ؟" ننھّے نے سوچا ۔

وُہ درخت کے پاس کھڑا تھا کہ اسے ایک اور چیز نظر آئی ، جس کی چار ٹانگیں تھیں اور پھُولی ہُوئی دُم تھی ۔ اِس چیز نے پہلے تو اِدھر اُدھر دیکھا پھر ناک سُکیڑ سُکیڑ کر ہوا میں سُونگھنا شروع کر دیا ۔ اِسے دیکھ کر ننھّے نے دل میں کہا "معلُوم ہوتا ہے اِسے ناک ہی سے سب باتوں کا عِلم ہو جاتا ہے ۔ ویسے جانور مزے کا ہے ۔ مگر اللہ جانے زمین والوں نے اس کا کیا نام رکھا ہے ۔"



یہ لومڑی تھی اور اِسے کسی شِکار کی تلاش تھی ۔ کیوں کہ اِس وقت اُسے سخت بھُوک لگ رہی تھی ۔ وُہ سُونگھتی سُونگھتی دُور نِکل گئی اور جب ننھّے کی

نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو ننھّے نے اُلّو کی طرف دیکھا جو آنکھوں میں آنکھوں ڈال کر اُسے دیکھ رہا تھا ۔ چند لمحے اُس نے زور سے ہُو ہُو کی اور پھر ایک ہی اُڑان میں دُور جنگل میں غائب ہو گیا ۔

لومڑی اور اُلّو کیا گئے ، ننھّے کے دِل بہلاوے کا سارا سامان چلا گیا ۔ وُہ اُداس ہو کر اَن گنت ٹمٹماتے ستاروں کو تکنے لگا ۔

اب وُہ کھڑے کھڑے تھک گیا تھا اِس لِیے ایک درخت کی کھُردری اور سخت چھال سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور دِل میں کہنے لگا "جی تو یہی چاہتا تھا کہ فوراً کام شروع کر دُوں مگر اس اندھیرے میں کہاں جاؤں ۔ اب سُورج نکلتے ہی اس دھرتی کے راز

معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ اور جس چیز کو ڈھونڈھ نکالنے کے لیے میں بے تاب ہو رہا ہوں وہ بھی صبح ہی کو نظر آئے گی۔ وہ چیز مجھ سے ملتی جلتی تو ہے مگر کیا نام تھا اُس کا ؟ اُس کے لفظ کا پہلا حرف الف ہے۔ ہاں یاد آگیا، یاد آگیا۔ وہ لفظ ہے "انسان۔"

قصبے کے لوگ ننھّے کی آمد سے بالکل بے خبر، نیند کے مزے لے رہے تھے۔ جب سبھی سو رہے تھے تو ننھّے نے کیا قصور کیا تھا کہ وہ جاگتا رہتا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کی آنکھ بھی لگ گئی۔

سُوٹ کے بدلے قمیص

جب پَو پھٹی اور نُور کی کرنیں چاروں طرف پھیل گئیں تو شاہو چودھری کے ڈربوں سے چوزے پھُدک کر باہر نکل آئے اور ان کی چوں چوں اور چڑیوں کی چیں چیں نے سارے گاؤں کو سر پر اُٹھا لیا۔

ننھّے نے اس چہکار کو سُن کر آنکھیں کھول دیں اور ایک دو جمائیاں لینے کے بعد اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنے سُنہری سُوٹ پر سے گھاس پھوس کو جھاڑا اور ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر چل پڑا جو باہر کو جاتی تھی۔ اس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ اُڑن طشتری کے واپس

آنے تک زمین اور زمین پر بسنے والوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ باتیں معلوم کر لے گا اور یوں نیند میں جو وقت ضائع ہو چکا تھا اس کی کسر نکال لے گا۔

اُس نے سامنے نظر اُٹھائی تو ایک چوڑے پاٹ کی ندی پر مچھیروں کی کشتیاں تیرتی نظر آئیں جن میں مچھلیوں کے ڈھیر لگ رہے تھے۔ کناروں پر لڑکے بالے جال پھیلائے بیٹھے تھے۔

ننھے نے ایک لڑکے کو دیکھا تو دل میں کہنے لگا "یہ لڑکا میرا ہم عُمر بھی ہے اور قد میں بھی میرے برابر ہے۔ کیوں نہ اِس سے بات کروں۔ مگر ایک بات سے ڈر لگتا ہے اگر یہ میری باتیں نہ سمجھ سکا تو ایسا

نہ ہو کہ مجھ پر حملہ ہی کر دے۔ مگر خیر" اس نے دل کو ڈھارس دیتے



ہوئے کہا "اگر اُس نے حملہ کر بھی دیا تو میں اُس سے نپٹ لوں گا۔" یہ سوچ کر وہ اُس لڑکے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکا اپنی کشتی

کی مرمّت کر رہا تھا۔ کیل ٹھکانے پر نہ لگی تو وہ بول اُٹھا "میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔"

ننھے نے یہ سُن کر کہا "او میاں بے وقوف۔"

لڑکا ہنس پڑا، بولا "ارے، تم اجنبی معلوم ہوتے ہو۔ کسی اور دیس سے آئے ہو۔ بھائی میرا نام بے وقوف نہیں، سراج ہے۔ سمجھے؟"

"معاف کرنا غلطی ہو گئی" ننھے نے کہا "سراج بھائی، وہ کیا رکھا ہے پوٹلی میں؟"

"روٹی ہے۔ کھاؤ گے؟"

"بھائی، مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ تھوڑی سی دے دو تو مہربانی ہو گی۔"

سراج نے اُسے دو روٹیاں اور تھوڑا سا آم کا اچار دے دیا۔

کھانا کھا چکا تو کہنے لگا۔ "یہ تو بڑے مزے کا کھانا تھا بھائی۔ تمھارا بہت بہت شکریہ۔"

"ارے بھئی رہنے دو شکریہ ڈکریہ۔ اچھا یہ تو بتاؤ، یہ تم نے عجیب سا لباس کیوں پہن رکھا ہے؟"

"یہ؟" ننھے نے اپنے سُوٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ خلائی سُوٹ ہے۔ اور اسے ہم اس وقت پہنتے ہیں جب ہمیں کسی اجنبی دیس میں جانا ہو۔"

"خلائی ولائی کے لفظ بول کر مجھے بے وقوف نہ بناؤ۔ بات اصل میں یہ ہے کہ تمھارا سُوٹ دیکھ کر میرا جی بہت للچا رہا ہے۔ اگر میرے پاس بھی ایسے کپڑے ہوتے تو میں خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ کم سے کم اِس

قمیص سے تو نجات مِل جاتی جو میں نے پہن رکھی ہے۔ جس سے زیادہ تو پیوند لگ رہے ہیں اس میں۔"

ننھا دِل میں کہنے لگا "بات تو ٹھیک کہی ہے اس نے۔ اس کی قمیص بہت پُرانی ہے۔ پیوند پر پیوند لگ رہے ہیں اِس میں۔ اور دائیں آستین تو بالکل پھٹ چُکی ہے۔ میں کہتا ہوں، اگر اُس نے میرے سُوٹ کو عجیب قِسم کا لباس کہا ہے تو یہی بات دُوسرے لوگ بھی کہیں گے اور ایسا نہ ہو کہ اُنھیں کچھ شُبہ ہو جائے اور ......"

اور اس نے فوراً اپنے دِل میں ایک فیصلہ کر لیا۔ وُہ بولا "اچھّا بھائی، اگر تمھیں یہ سُوٹ پسند ہے تو لے لو لیکن اِس کے بدلے مجھے اپنی قمیص اور پاجامہ دے دو۔ ٹھیک ہے نا؟

"ارے میاں تم تو بہت اچھّے ہو۔ لو، بسم اللہ۔ اُتارو کپڑے۔"

اور پھر اُنھوں نے اپنے اپنے کپڑے ایک دُوسرے سے بدل لیے۔

سراج کی تو پُوچھو نہیں۔ سُوٹ پہن کر وُہ تو خُوشی کے مارے ناچ اُٹھا۔ کبھی اِدھر اُچھلتا تھا اور کبھی اُدھر پھُدکتا تھا۔ اور کبھی سینہ تان کر کہتا تھا "واہ وا، یُوں معلُوم ہوتا ہے جیسے یہ کپڑے تم میرے ہی لیے سِلوا کر لائے تھے۔ میرے دوست دیکھیں گے تو اُن کی آنکھیں چُندھیا جائیں گی۔"

ننھے نے اس کا لباس پہن لیا اور پُوچھنے لگا:

"اور ہمارے متعلّق کیا رائے ہے آپ کی؟"

"ارے بھئی حد ہو گئی۔ یُوں معلُوم

ہوتا ہے جیسے تُم پیدا ہی مچھیروں کے گھر ہُوئے تھے۔"

"بہُت خُوب۔ تو اچھا بھائی ۔ خُدا حافِظ۔"

آنکھوں دیکھا حال

ندی سے کوئی دو سو گز دُور گاؤں کے بڑے جوہڑ کے قریب ، حلوائی کی دُکان تھی۔ یہاں بچّے اپنی اپنی پسند کی مٹھائی خریدا کرتے تھے۔ حلوائی بڑا صاف سُتھرا تھا۔ وہ چیزوں کو جالیوں کے اندر رکھتا تھا تا کہ وُہ کیڑوں مکوڑوں اور مکھیوں سے محفُوظ رہیں۔

جب سکُول میں آدھی چھُٹّی ہوتی تو دُکان پر بچّوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ حلوائی کو سر کھُجانے کی فُرصت نہ مِلتی۔ کوئی لڈّو مانگتا تو کوئی جلیبی۔ کوئی کہتا رس گُلّے دے دو تو کوئی گلاب جامن کی رٹ لگاتا۔ غرض بڑی گہما گہمی ہوتی

اختر اور اس کے دوست عزیز، سعید اور لطیف بھی ہر روز یہیں اکٹھے ہُوا کرتے تھے۔

ابھی سکُول کا گھنٹا بجنے میں کچھ دیر تھی کہ سعید گیند بلّا سنبھالے حلوائی کی دُکان کے پاس پہنچ گیا۔

اتنے میں عزیز بھی اِدھر آتا ہُوا دِکھائی دِیا۔ اُس نے بھی کل رات آسمان پر وُہ عجیب چیز دیکھی تھی جو اختر کو دِکھائی دی تھی۔ اس کی آنکھیں ابھی تک اس چیز کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وُہ اِنہی خیالوں میں مگن چلا آ رہا تھا کہ سیدھا سعید سے جا ٹکرایا اور ٹکراتے ہی بول اُٹھا:

"سعید، تُم نے بھی کل رات کوئی عجیب چیز دیکھی تھی؟"

سعید نے کہا "تمھاری مُراد اُڑن طشتری

سے ہے نا؟"

"ہاں ہاں وہی۔ بالکُل وہی" عزیز



نے کہا۔ "صُبح کو میں نے امّی سے اس کا ذِکر کِیا تو وُہ ہنس پڑیں اور کہنے

لگیں کہ تُم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو گا۔"

سعید بولا۔ "میری امّی نے تو حد ہی کر دی۔ وُہ میری بات سُن کر کہنے لگیں کہ تُمھارے پیٹ میں کوئی خرابی ہے جو ایسے خواب دیکھتے ہو۔ میں تُمھارے ابّو سے کہوں گی کہ تُمھیں حکیم کے پاس لے جائیں۔"

عزیز بولا "یہ بڑے بُوڑھے اللہ جانے ہماری باتوں کا اِعتبار کیوں نہیں کرتے۔ خیر، یہ بتاؤ بھلا اِس کی شکل کیسی تھی؟"

"بالکُل لٹّو کی طرح۔ اگر لٹّو پر اوندھا ٹوکرا رکھ دو تو اُسے چھوٹی سی اُڑن طشتری سمجھ لو۔"

"اور کُچھ؟"

"اور اُس کی ٹونٹیوں سے سبز اور سُرخ

شُعلے نکل رہے تھے اور وُہ ساری کی ساری اِتنی روشن تھی کہ آنکھیں چُندھیا جاتی تھیں۔"

"بھئی واہ، خُوب نقشہ کھینچا ہے تُم نے اُس کا۔" ابھی وُہ کُچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ سامنے سے لطیف آتا دِکھائی دیا۔ اُس کے ابّو کراچی گئے ہُوئے تھے اس نے اُن کے قریب آ کر کہا ——

"السّلامُ علیکُم!"

"وعلیکُم السّلام۔ بتاؤ رات کیسی گزری؟"

"بڑے چین سے گُزری۔ مگر تُم کیوں پُوچھتے ہو؟"

"دُنیا بھر میں چرچے ہو رہے ہیں رات والی اُڑن طشتری کے اور جناب کہہ رہے ہیں رات بڑے چین سے گُزری۔" عزیز نے جل بھُن کر کہا۔

"تُم تو یُوں ہی گرم ہو رہے ہو۔ وُہ اُڑن طشتری تو میں نے بھی دیکھی تھی

مگر مجھے دُوسرے غم تھوڑے ہیں جو اس کا غم کرتا پھروں۔"

عزیز اور سعید اُسے اُداس دیکھ کر بات تاڑ گئے اور عزیز نے بڑے میٹھے لہجے میں کہا۔ "بھئی معاف کرنا۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ کہو، تمھارے ابّو کا کوئی خط آیا کہ نہیں؟"

"صِرف ایک خط مِلا تھا اور اس میں بھی دو سطریں لکھی تھیں۔"

"اچھّا بھئی، ہماری دُعا ہے کہ تمھارے ابّو خیر خیریت سے ہوں۔"

عزیز نے کہا "میری ایک تجویز ہے اور وہ یہ کہ جب ماسٹر صاحب ہمیں سبق پڑھا چکیں تو ہم اُنھیں اُڑن طشتری کی بات بتائیں اور ننھّے کے سیڑھی سے اُترنے والا قِصّہ بھی ......"

اُس نے جُملہ اُدھورا چھوڑ دیا اور

لطیف اور سعید کو یُوں تکنے لگا جیسے پُوچھ رہا ہو کہ تُم نے بھی دیکھا تھا ننھّے کو سیڑھی سے اُترتے ہُوئے؟

سعید نے کہا۔ "تُم نے جُملہ اُدھورا کیوں چھوڑ دیا؟ تُم کوئی جھوٹ تھوڑی بول رہے ہو۔ ننھّے کو سیڑھی سے اُترتے ہُوئے میں نے بھی دیکھا تھا۔ اور لطیف نے بھی۔" پھر لطیف سے کہنے لگا۔ "کیوں لطیف، ٹھیک ہے نا؟"

"بالکُل ٹھیک۔" لطیف نے کہا اور عزیز نے اُدھوری بات کو پھر چھیڑا "ہم ماسٹر صاحب سے کہیں گے کہ جناب، آپ نے ہمیں قُدرت کے نظّارے پر ایک جواب مضمون لکھنے کو کہا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ میں تُمھیں جنگل کی سیر کو لے جاؤں گا تاکہ تُم خُود اپنی آنکھوں سے قُدرت کے نظّارے دیکھو۔ تو

تُم کون ہو؟

ابھی وُہ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ لڑکا چُپکے سے اُن کے پاس آ کھڑا ہُوا اور بولا "سلامٌ علیکم" اُس نے یُوں کہا جیسے ان سے اُس کی پُرانی جان پہچان ہے۔

سعید نے جواب میں کہا "وعلیکُم السّلام" اور یہ کہہ کر اُسے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے دِل میں کہا "یہ شاید ہمارے گاؤں میں نیا نیا آیا ہے۔ اگر میں اِسے اپنے سکُول کی ٹیم میں شامِل کر لُوں تو کیا رہے۔ بدن کا مضبُوط اور چُست ہے۔ آنکھوں سے دلیری ٹپکتی ہے۔"

عزیز اور لطیف نے کنکھیوں سے ننھّے کی قمیص کو دیکھا جو جگہ جگہ سے پھٹی ہُوئی تھی۔ وُہ سمجھے کہ یہ کِسی مچھیرے کا بیٹا ہے۔

چند منٹ بعد ننھّے نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"میرا نام آفاقی ہے اور آپ کا نام کیا ہے؟"

لڑکوں نے اُسے اپنا نام بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ سکُول جانے سے پہلے یہاں اکٹھے ہُوا کرتے ہیں اور اُن کا ایک اور بھی دوست ہے جس کا نام اختر ہے۔ وہ کلاس کا مانیٹر ہے، اِس لِیے اُسے ہم سب سے پہلے سکُول پہنچنا ہوتا ہے۔ ہماری اور اس کی مُلاقاتیں سکُول میں ہُوا کرتی ہیں۔

زمین پر آنے سے مہینوں پہلے آفاقی

کے ماسٹر صاحب نے اُسے زمین والوں کی زبان سکھائی تھی اور اس نے بھی جی لگا کر اُسے سیکھا تھا۔ وُہ لڑکوں کا ایک ایک لفظ اچھّی طرح سمجھ رہا تھا۔

"کیا آپ کا سکُول یہاں سے بہُت دُور ہے؟ جی چاہتا ہے میں بھی وہاں جاؤں۔"

"تُم جانے کو کہہ رہے ہو۔ حال آں کہ تُمھیں وہاں داخل ہونا چاہیے تھا۔ چودھری شاہُو نے تُمھیں آوارہ پھرتا دیکھ لیا تو شامت آ جائے گی۔ وُہ اس گاؤں کی پنچایت کا چودھری ہے اور اُسے بچّوں کو تعلیم دلانے کا بہُت شوق ہے۔ جُوں ہی اُسے کوئی لڑکا گھومتا گھامتا نظر آیا اور وُہ اسے دھکیل کر لے گیا۔ بڑے ماسٹر صاحب کے پاس۔ پھر جناب، تُم چُوں کرو یا چاں، وُہ تمھیں سکُول میں

داخل کروا کر ہی دم لے گا۔ ذرا ہُشیار رہنا اِس سے۔"

"جی ہاں" لطیف نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہُوئے کہا "تم لاکھ کہو، ہائے میری میّا، مگر توبہ کرو وُہ تمھیں بخشنے گا نہیں۔"

"میّا کا کیا مطلب ہے؟" ننّھے نے حیرت سے پُوچھا۔

"بھئی واہ۔ اِتنا آسان لفظ ہے اور تُم اِس کا مطلب پُوچھ رہے ہو۔ بھلا یہ تو بتاؤ، تُم آئے کِس دیس سے ہو؟"

"اُس دیس سے" آفاقی نے اُنگلی سے آسمان کی طرف اِشارہ کرتے ہُوئے کہا۔

"ہاہا۔ آسمان سے آئے ہو۔ خیر، کہیں سے آئے ہو، چودھری شاہُو سے بچ کر رہنا۔ یہ تمھیں ہماری آخری نصیحت ہے" عزیز بولا۔

"اچھا بھئی، خدا حافظ۔ اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں خوشی سے تمھارے ساتھ سکول کو جاتا۔ ابھی تو مجھے تمھارے گاؤں کی سیر کرنی ہے۔"

لڑکوں نے جانے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ سڑک کے اُس پار شور و غل سُنائی دیا۔

"یہ ساجا اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ اب کے نہیں چھوڑوں گا اسے۔ مار مار کر بندر نہ بنا دیا تو سعید نام نہیں۔" سعید نے غصّے سے کہا۔

سڑک کے اُس پار، دو لڑکے کندھوں پر بستے لٹکائے کھڑے تھے۔ ایک سات سال کا ہو گا اور دوسرا گیارہ سال کا تھا بڑا لڑکا چھوٹے کے ہاتھ مروڑ رہا تھا اور وہ بُری طرح چیخ رہا تھا۔ سعید سے اس کی چیخیں نہ سُنی گئیں وہ وہیں

سے للکارا:

"چھوڑ دے جعفر کو ورنہ آ کر ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔"

اور یہ کہہ کر وہ اُدھر جانے کو تھا کہ آفاقی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا "میں چکھاتا ہوں مزا اِسے۔ تم تکلیف نہ کرو۔"

"تو آؤ پھر میرے ساتھ۔" سعید بولا۔

"وہاں جانے کی ضرورت نہیں۔" یہ کہہ کر آفاقی نے اپنی لمبی پتلی اُنگلی ساجے کی طرف اُٹھا دی اور نظریں اُس پر گاڑ دیں۔

چند منٹ پہلے ساجا باؤلے کُتے کی طرح جعفر سے چھینا جھپٹی کر رہا تھا۔ لیکن ایک دم وہ یُوں چُپ چاپ کھڑا ہو گیا جیسے اس پر آسمان سے بجلی گری ہو اور وہ زمین میں گڑ کر رہ گیا ہو۔

جناب ہمیں آج ہی لے چلیے ۔ جب ہم جنگل میں پہنچیں گے ۔ تو قدرت کے نظارے دیکھنے کے ساتھ ساتھ اُس ننھّے کا بھی کھوج لگائیں گے ۔ مجھے یقین ہے کہ وُہ وہیں کسی جھاڑی میں چھُپا بیٹھا ہو گا ۔"

سعید نے اُس کی باتیں سُن کر کہا ۔

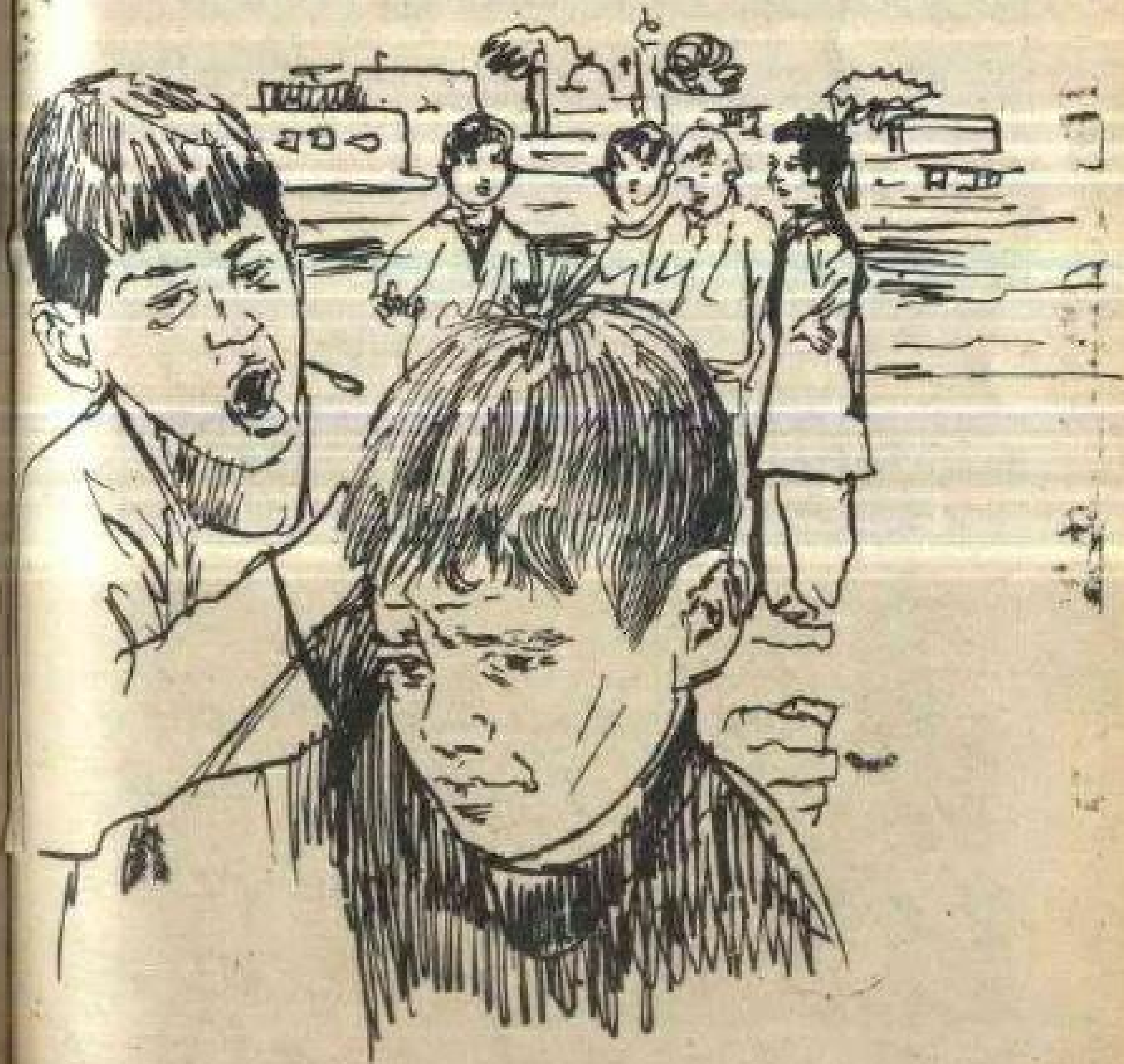
"واہ وا ، بھئی خُوب سُوجھی تمھیں ۔ یہ تو پکّی بات ہے کہ ہم سب نے اُسے جنگل کی طرف بھاگتے ہُوئے دیکھا تھا ۔"

تینوں اِس تجویز پر بہت خُوش تھے اور سکُول کی طرف جانے والے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے سے ایک لڑکا چلا آ رہا ہے ۔

تینوں اُسے دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گئے ۔ وُہ گاؤں کے ایک ایک لڑکے کو پہچانتے تھے ۔ اِس لڑکے کو اُنھوں نے کبھی نہیں

دیکھا تھا ۔ دیکھتے بھی کیسے ۔ وُہ تو دُوسری دُنیا سے آیا تھا ۔

اُس کے بازُو درخت کی شاخوں کی طرح
لٹک رہے تھے ۔ بے جان ، مُردہ سے ۔
جعفر خُوشی سے چیختا چلاتا ، ساجے کا
مُنہ چڑاتا ، بھاگتا ہُوا کہیں کا کہیں نکل



گیا ۔ اُدھر جعفر نظروں سے اوجھل ہُوا
اور اِدھر ساجے نے اپنا مُڑا تُڑا ہاتھ
ہائے ہائے کرتے ہُوئے اُوپر اُٹھایا اور
پھر سر کو یُوں کھُجلایا جیسے پُورا آسمان
اس کے سر پر آ گرا تھا ۔

یہ تماشا دیکھ کر سعید ، عزیز اور
لطیف کا مُنہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا تھا ۔
وُہ سکول کو جاتے ہُوئے سارے راستے
آفاقی کے اسی کرتب کی باتیں کرتے رہے ۔

سکول میں داخل ہُوئے تو سعید کہہ
رہا تھا " حد ہو گئی ، حد ہو گئی "۔

عزیز کہہ رہا تھا ۔" اُس نے تو کمال
ہی کر دیا "۔

لطیف کہہ رہا تھا " مُجھے تو یہ جادُوگر
معلُوم ہوتا ہے ۔ ننّھا مُنّا جادُوگر "۔

اتنے میں اُن کی مُڈبھیڑ اختر سے
ہو گئی جس نے مزے لے لے کر اُن

کو رات والی اُڑن طشتری کی کہانی سُنانا شروع کر دی۔

"ارے ماسٹر صاحب، جو چیز ہم ابھی ابھی دیکھ کر آئے ہیں، وہ تُم نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہو گی۔" عزیز نے کہا۔ اور پھر الف سے یے تک سارا قِصّہ بیان کر دِیا۔ اختر ہکّا بکّا رہ گیا اور بولا:

"کمال کر دِیا اس لڑکے نے۔ میں کہتا ہوں، کہیں وُہ جادُوگروں کے مُلک سے نہ آیا ہو۔ مجھے تو اس سے ڈر لگتا ہے۔ کیا معلوم کِسی وقت کوئی ایسا فِتنہ اُٹھا دے کہ ہم مُنہ تکتے رہ جائیں۔"

"یہ تُم نے جادُو کی رٹ کیا لگا رکھی ہے۔ سائنس نے ایسی ایسی کمال کی چیزیں اِیجاد کی ہیں کہ اگر ہم اِن

کے مُتعلّق سوچیں ہی تو ہماری عقل چکرا جائے۔ میرے خیال میں بہتر یہ ہو گا کہ ہم ماسٹر حیدر جی کو ساری بات بتا دیں۔ دیکھیں وُہ کیا کہتے ہیں۔"

ماسٹر جی نے گتھی سلجھا دی

ماسٹر حیدر جی بہت ہنس مکھ آدمی تھے مگر آج وہ اپنی کرسی پر اُداس سے بیٹھے ہوئے تھے۔ رات اُنھوں نے بھی آسمان پر اُڑن طشتری اُڑتی ہوئی دیکھی تھی۔ اُنھیں رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ شاید میرا دماغ ٹھکانے نہیں رہا۔ اِسی لیے عجیب عجیب چیزیں میری نظروں کے سامنے گھومنے لگی ہیں۔

جب وہ جماعت کو پڑھا چکے تو اختر، عزیز، لطیف اور سعید اُن کے قریب آ کھڑے ہوئے۔ سعید کہنے لگا:

"جناب، اِجازت ہو تو ایک بات پُوچھیں؟"

"ہاں ہاں۔ شوق سے پُوچھو۔" ماسٹر جی نے کہا۔

"جناب، آپ نے رات کوئی عجیب و غریب چیز دیکھی تھی؟"

"ہاں۔ دیکھی تو تھی۔" وہ چونک کر بولے "لیکن میں نے جس سے بھی بات کی اس نے مجھے یُوں دیکھا جیسے میں پاگل ہُوں۔ صُبح سویرے ڈاکیا آیا تو میں نے رات والی بات اس کو بتائی وُہ سُنتے ہی کہنے لگا کہ حضرت جی، اگر آپ بُوڑھے ہوتے تو ہم کہتے کہ سٹھیا گئے ہیں۔ مگر آپ تو خیر سے جوان ہیں۔ اس عُمر میں ایسی باتیں کرنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ سکُول کے راستے میں غُلام رسُول بساطی کی دُکان آتی ہے اُس سے بھی میں نے اُس عجیب و غریب چیز کا ذِکر کر دیا۔ وُہ اس زور سے

کِھل کِھلا ہنسا کہ میں تو ڈر ہی گیا۔ جب ذرا ہنسی تھمی تو کہنے لگا کہ ماسٹر جی، کہیں لڑکوں سے ایسی بات نہ کر بیٹھیو۔ ورنہ وُہ آپ پر ہنسیں گے۔"

"اور آپ نے ایک لڑکے کو سیڑھی سے اُترتے بھی دیکھا ہو گا؟" اختر نے پُوچھا۔

"ہاں ہاں۔ وُہ اُترتے ہی جنگل میں غائب ہو گیا تھا۔ خُدا کا شکر ہے کہ



میں نے اس کے مُتعلق ان لوگوں کو نہیں بتایا۔ ایک حرف بھی کہہ دیتا تو وُہ مجھے پاگل سمجھ بیٹھتے۔"

"مگر لوگ اِتنے تھڑدِلے کیوں ہوتے ہیں؟ اِن میں اِتنا حوصلہ کیوں نہیں ہوتا کہ دُوسروں کی بات ٹھنڈے دِل سے سُننے اور سمجھنے کی کوشش کریں؟ یہ تو بہت بُری بات ہے۔"

"ہاں، بُری بات ہے۔ مگر کیا کیا جائے۔ لوگ صرف اُسی بات کو سچ سمجھتے ہیں جسے اُنھوں نے خُود دیکھا ہو یا اُس کے بارے میں پہلے سے سُن رکھا ہو۔"

"جناب، ابھی کچھ دِن ہُوئے میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ امریکہ میں کسی جگہ لوگوں نے آسمان پر ایک اُڑن طشتری اُڑتی دیکھی تھی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے بھی اخباروں اور رسالوں میں اس کی بابت بہت کچھ پڑھا ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو چند باتیں ہمیں بھی بتا دیجیے۔"

"اخباروں میں اُڑن طشتریوں کی بہت سی تصویریں چھپی ہیں۔ خاص طور پر ایک تصویر نے تو ساری دُنیا میں کھلبلی مچا دی تھی۔ یہ نیو میکسی کو (امریکہ) میں لی گئی تھی۔ اس میں ایک دُھندلی سی پہیّے جیسی چیز نظر آتی ہے جو چمکتی ہوئی، بجلی کی تیزی کے ساتھ جنگل کے اُوپر سے گزر رہی ہے۔"

"تو کیا ابھی تک یہ پتا نہیں چل سکا کہ یہ کیا چیز تھی؟"

اس کے مُتعلِّق بہت سے سائنس دان چھان بین کر رہے ہیں۔ امریکہ کے ہوا

بازی کے محکمے نے اپنے ایک سائنس دان کی رپورٹ چھاپی ہے جس میں لکھا ہے کہ موسمی حالات کی چھان بین کے لیے بہت بڑے بڑے غبارے چھوڑے جاتے ہیں۔ جب ان میں سے بعض غبارے بہت اُوپر جا کر بھٹک جاتے ہیں تو یُوں نظر آتا ہے جیسے یہ غبارے نہیں اُڑن طشتریاں ہیں۔ ایک اور سائنس دان کا کہنا ہے کہ جب بڑی بڑی دلدلوں میں سے گیس نکلتی ہے۔ تو وُہ اُوپر جا کر طشتریوں کی سی شکل کے بادلوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

غرض کوئی سائنس دان کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔ مگر وُہ اُس کی کھوج برابر لگا رہے ہیں اور اُمّید ہے کہ کسی نہ کسی دن یہ ضرور پتا چل جائے گا کہ یہ اُڑن طشتری اصل میں ہے

کیا چیز۔"

لڑکے بڑے غور سے ماسٹر جی کی باتیں سُن رہے تھے۔ جب وہ خاموش ہوئے تو لطیف نے کہا:

"لیکن جناب، سائنس دان جو جی میں آئے کہتے رہیں۔ ہم نے تو خود اپنی اِن آنکھوں سے اُڑن طشتری دیکھی ہے اور پھر اِتنا ہی نہیں بلکہ ایک لڑکے کو بھی دیکھا ہے جو اِس میں سے اُترا تھا اور اُترتے ہی جنگل میں غائب ہو گیا تھا۔"

"تُم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر یہ تو بتاؤ بھلا کتنے لوگ ہماری باتوں کو سچّی باتیں سمجھیں گے؟ اِس لیے ہمیں ابھی صبر سے کام لینا ہو گا۔"

اور جناب، ہم آپ کو ایک اور عجیب بات بتانا تو بھول ہی گئے۔

ہمارے لیے وہ بات اُڑن طشتری سے بھی زیادہ اچھنبے کی ہے۔ جب ہم سکُول آ رہے تھے تو ہمیں ایک اجنبی لڑکا مِلا جس نے اُنگلی کے اِشارے سے ساجے کو پتھّر کا بُت بنا دیا۔ ساجا ایک بچّے کو مار رہا تھا۔ جب ہم نے پہلے پہل اِس لڑکے کو دیکھا تو ہم سمجھے کہ وہ کسی مچھیرے کا لڑکا ہے۔ مگر جناب، اِس تماشے کے بعد تو ماننا پڑتا ہے کہ وہ کوئی عام لڑکا نہیں بلکہ کوئی بہُت بڑا جادُوگر ہے۔ میں سوچتا ہُوں یہ کہیں وہی لڑکا تو نہیں جو رات اُڑن طشتری سے اُترا تھا؟"

"اب سمجھا کہ تُم اِس قِصّے کو اُڑن طشتری والی بات سے کیوں مِلا رہے ہو۔"

"مگر جناب، اب ہمیں یہ فِکر ہے

کہ وُہ نہ جانے کیا گُل کِھلائے ۔ ہمیں تو اُس سے ڈر لگتا ہے۔"

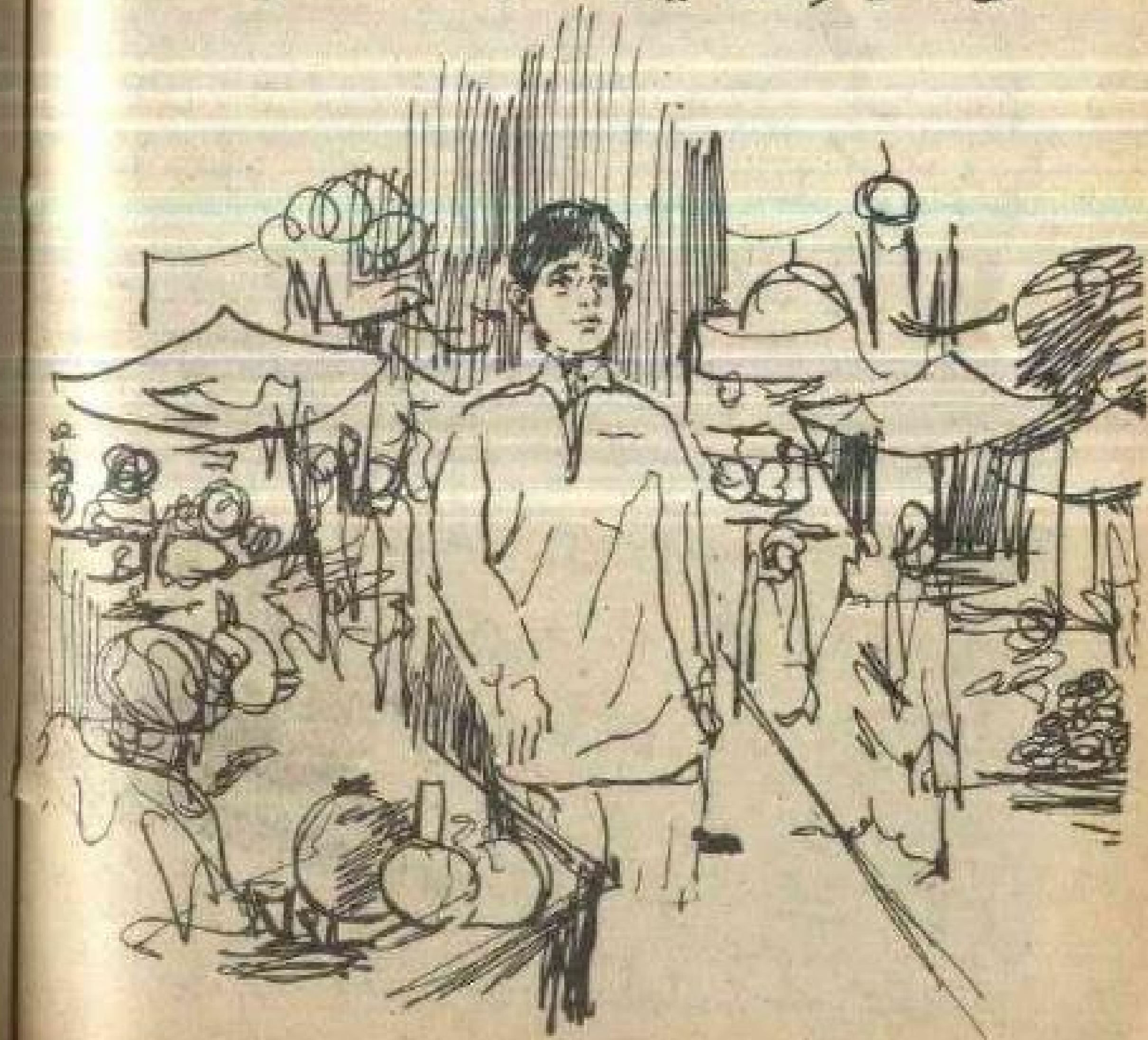
"ڈرنے کی کوئی بات نہیں ۔ اگر وُہ کچھ کرے گا بھی تو بھلے کے لیے کرے گا ۔ بُرے کے لیے نہیں۔"

شاہو چودھری سے مڈ بھیڑ

اختر، لطیف، سعید اور عزیز تو ماسٹر جی سے باتیں کر رہے تھے اور آفاقی گاؤں کے گلی کوچوں میں گھوم رہا تھا ۔ وُہ اِس کوشش میں تھا کہ زمین کی ہر چیز کا نقشہ اپنے دِل میں پُوری پُوری طرح اُتار لے ۔

گاؤں میں لے دے کے دو ایک ہی بازار تھے اور وُہ بھی تنگ اور بے رونق سے ۔ ایک سبزی والے کی دُکان پر اُس کی نظر انڈوں جیسی لال لال چیزوں پر پڑی تو سوچ میں پڑ گیا ۔ اور پھر جب کچھ یاد آیا تو کہنے لگا، "یہ تو ٹماٹر ہیں ۔" ذرا آگے موچی کی

دُکان تھی جس میں رنگ برنگے جُوتوں کی بھر مار تھی۔ کچھ جُوتے تو دروازوں میں لگی ہُوئی کیلوں میں ٹنگے ہُوئے تھے اور کچھ فرش پر پڑے ہُوئے تھے۔ آفاقی اُنھیں دیکھ کر خُوش ہو رہا تھا کہ اِتنے میں کسی نے پیچھے سے



کڑک کر پُوچھا۔ "ارے او لڑکے، سکُول سے بھاگ کر آیا ہے کیا؟"

آفاقی نے مُڑ کر جو دیکھا تو اُس کے پیچھے ایک لمبا تڑنگا شخص کھڑا تھا۔ بڑی بڑی مُونچھیں، سر پہ پگڑ اور ہاتھوں میں ایک بھاری بھر کم سونٹا۔ آفاقی اُسے ایک ہی نظر میں دیکھ کر جان گیا کہ یہی وُہ چودھری شاہو ہے جس کا ذکر وُہ لڑکے کر رہے تھے۔

اُس نے چودھری کو ادب سے سلام کر کے کہا "جناب، جب میں آپ کے سکُول میں داخل ہی نہیں ہُوا تو بھاگنا کیسا؟"

"ہُونہہ، تم کسی قدر چالاک بھی معلُوم ہوتے ہو۔ بس، اب میں زیادہ باتیں نہیں سُننے کا۔ میرے پیچھے پیچھے چُپ

چاپ چلے آؤ ورنہ ....“

اور اِس کے بعد چودھری آگے آگے ڈگ بھرتا ہُوا جا رہا تھا اور اُس کے پیچھے پیچھے سر جُھکائے آفاقی چل رہا تھا۔

تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد دونوں سکول میں داخل ہو گئے۔ چودھری شاہو سیدھا ماسٹر حیدر کے کمرے میں چلا گیا اور آفاقی کو ماسٹر جی کے سامنے کھڑا کر کے بولا ”لیجیے ماسٹر صاحب، ایک اور شاگرد۔ میں اِن مچھیروں کو بہتیرا سمجھاتا ہُوں کہ اگر خُود پڑھ لکھ نہیں سکے تو اولاد کو تو دو حرف سیکھنے دو۔ مگر کون سُنتا ہے۔ یہ ننّھا شتونگڑا آوارہ پھر رہا تھا کہ میں اسے اِدھر کھینچ لایا ہُوں۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔ میں چلا۔“

ماسٹر حیدر نے کہا ”چودھری صاحب، آپ بہت نیک آدمی ہیں۔ اللہ آپ کو اِس

نیکی کا بدلہ دے گا۔“

یہ کہہ کر وُہ آفاقی کو کلاس میں لے آئے جہاں اختر، لطیف، سعید اور عزیز سبق یاد کر رہے تھے۔ ماسٹر صاحب اِن سے کہنے لگے ”لو بھئی، پہچانو اسے۔ یہ کون ہے؟ اسے ابھی ابھی چودھری صاحب ہمارے پاس چھوڑ گئے ہیں۔ میں نے اسے ایک نظر دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ ہو نہ ہو یہ وہی لڑکا ہے جس کا تُم ذکر کر رہے تھے۔“

پھر اُنھوں نے آفاقی سے کہا ”اچھّا بھئی ننّھے۔ اب تُم اپنے ساتھیوں کے پاس اس خالی ڈسک پر جا کر بیٹھ جاؤ۔ کُچھ اپنے زمین والے بھائیوں سے سیکھو اور کُچھ اِنھیں سکھاؤ۔ یُوں جب ہم ایک دُوسرے سے جُدا ہوں گے تو تُم ہمیں یاد کیا کرو گے اور ہم تمھیں۔“

حساب آسان ہو گیا

آفاقی کے چاروں دوست اِس سے مِل کر بے حد خُوش تھے۔ مگر ساجد اُسے دیکھ کر کچھ سہم سا گیا تھا۔

آفاقی کے دوست اس سے کئی باتیں پُوچھنا چاہتے تھے مگر حساب کا گھنٹا شرُوع ہونے والا تھا اِس لِیے اُنھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ جو کچھ پُوچھنا ہے کھیل کُود کے وقت پُوچھ لیں گے۔

ماسٹر جی نے لڑکوں کو ترازُو اور باٹ دے رکھے تھے اور ایک طرف کنکریوں کی ڈھیری لگا دی تھی۔ اب اُنھیں کنکریوں کا وزن معلُوم کرنا تھا۔ سعید نے آفاقی کو بھی کاپی اور پنسل دے دی اور کہنے لگا "یہ رہی ترازُو اور باٹ اور وُہ رہی کنکریوں کی ڈھیری، ایک پلڑے میں باٹ رکھو اور دُوسرے میں کنکریاں۔ پھر باٹوں کو ضرب دے کر اِن کا وزن معلُوم

کر لو۔ سمجھ گئے نا؟"

آفاقی نے پلک جھپکتے میں کنکریوں کو تول کر ان کا وزن زبانی بتا دیا۔ چاروں دوستوں نے اُس کے جواب کو پرکھا تو بالکُل صحیح پایا۔ وُہ ہکّا بکّا رہ گئے۔

سعید بولا "کمال کر دیا بھئی تُم نے تو۔ سوال کو چُٹکی بجاتے حل کر دیا ہے۔"

لطیف کہنے لگا "بھئی، اِس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ تُم حساب میں ہم سے بہُت آگے ہو۔"

آفاقی نے اُنھیں اپنے کام کرنے کا طریقہ بتایا جو ان کے طریقوں کے مُقابلے میں بہُت آسان بھی تھا اور وقت بھی کم لیتا تھا۔

ماسٹر صاحب ہولے ہولے قدم اُٹھاتے ہُوئے ان کے پاس آ گئے اور کہنے لگے:

"کیوں بھئی۔ دیکھ لیا تم نے کہ آفاقی تم سے کہیں زیادہ ہوشیار ہے اور جو سوال تم حل کر رہے ہو وہ اُس کے نزدیک بچّوں کا کھیل ہے۔ کیوں بھئی غلط تو نہیں ہے میری بات؟"

آفاقی نے ادب سے کہا "آپ ہمارے بزرگ بھی ہیں اور اُستاد بھی۔ پھر بھلا آپ کی بات کیوں غلط ہونے لگی۔ میں ان سوالوں سے کہیں مُشکِل سوال نکال سکتا ہوں۔ برسوں پہلے ہم لوگ بھی آپ ہی کی طرح کے قاعدوں سے کام لیتے تھے۔ مگر جب سے مشینوں کے ذریعے تعلیم شرُوع ہُوئی ہے، مُشکل سے مُشکل سوال چُٹکی بجاتے حل ہو جاتے ہیں۔ میں ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا تھا۔ ہماری دُنیا آپ لوگوں کی دُنیا سے کروڑوں سال



پُرانی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ایک دم چُپ ہو گیا اور دل میں کہنے لگا "ایسا نہ ہو یہ لوگ میری باتیں سُن کر ڈر جائیں۔"

اِس کے چُپ ہو جانے پر ماسٹر جی کہنے لگے "ننھّے، تمھارے دوست تم سے چند باتیں پُوچھنے کے لیے سخت بے تاب ہیں۔"

"بڑے شوق سے پُوچھ سکتے ہیں۔" آفاقی بولا۔

کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے

"اچھا" سعید نے کہا "سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تُم نے ساجے کو کیسے قابُو میں کر لیا تھا؟ کوئی منتر پڑھا تھا اس پر یا کوئی ٹونا کیا تھا؟"

"نہ بھائی" آفاقی نے جواب دیا۔ "نہ تو میں نے کوئی ٹونا کیا تھا اور نہ کوئی منتر پھُونکا تھا۔ میں نے صِرف اپنے خیال کے زور سے اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے تھے۔ ہمارے ہاں کسی کو دُکھ دینا سخت منع ہے اگر کوئی شخص دھونس اور دھاندلی سے کام لے کر اپنا کام نکالنا چاہے تو ہم خیال کے زور سے اسے منٹوں میں

اپنا تابع کر لیتے ہیں۔"

"بھئی، ہمیں تو تمھاری بات کا یقین نہیں ہے۔" عزیز نے کہا۔

"اچھا تو پھر آؤ، دو دو ہاتھ ہو جائیں۔" آفاقی نے ہنس کر کہا۔

"نا بابا۔ نہ۔" عزیز نے گھبرا کر کہا "میری توبہ۔"

"لیکن تم اس پر اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو؟" ماسٹر جی نے کہا۔ "پچھلے سال ہمارے سکول میں ایک مسمریزم والا آیا تھا۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ وہ اختر کو کس طرح اپنی انگلیوں پر نچا رہا تھا۔ اختر بے چارے کی مجال نہیں تھی کہ اس کی اجازت کے بغیر ذرا بھی حرکت کر سکے۔ بس ننھے کو بھی تم ایک ننھا منا مسمریزم والا سمجھ لو۔ کیوں بھئی ننھے، ٹھیک ہی کہہ

رہا ہوں نا؟" ماسٹر جی نے کہا اور سب کے ہنسنے پر وہ خود بھی ہنس پڑے۔

"اب میری باری ہے۔" اختر نے کہا "مجھے صرف یہ پوچھنا ہے کہ تم آئے کہاں سے ہو؟"

"رات کو تم تاروں بھرے آسمان کو تو دیکھتے ہو گے۔" ننھے نے کہا "اور تم نے ان تاروں کو گننے کی کوشش بھی کی ہو گی لیکن جلد ہی ہار مان لی ہو گی۔ اگر تم ہزار سال بھی ان کی گنتی کرتے رہو تو بھی وہ گنے نہ جا سکیں گے۔ اس کائنات میں تمھاری دنیا جیسی لاکھوں دنیائیں ہیں۔ ان میں کچھ آباد ہیں اور کچھ غیر آباد۔ میں ایک ایسی ہی دنیا سے آیا ہوں جو آباد ہے اور اگر وہاں جانا چاہو تو لاکھوں میل کا فاصلہ طے کرنا پڑے

گا۔"

"اچھا یہ بتاؤ، ہماری دُنیا اچھی ہے یا تُمھاری؟"

"دونوں ہی اچھی ہیں لیکن بھئی مجھے تو اپنی دُنیا ہی اچھی لگتی ہے۔ اپنا گھر پھر اپنا ہوتا ہے۔"



"اچھا بھئی، یہ تو ہم نے مان لیا کہ

تُم ہم سے بہُت زیادہ لائق فائق ہو۔ لیکن یہ بتاؤ کہ ساجے والی کرامت کے علاوہ کوئی اور بھی کرامت جانتے ہو تُم؟"

"ایسی کئی کرامتیں میری مُٹھی میں بند ہیں۔ ہم میں ایک کمال یہ ہے کہ ہم لوگوں کے دلوں کی باتیں بتا سکتے ہیں اور یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ آیندہ کیا ہونے والا ہے۔"

"سچ؟ اچھا تو بتاؤ، آج شام ہمارے گھر کیا ہونے والا ہے؟" لطیف نے پُوچھا۔

"آج شام کی ڈاک سے تمھیں ایک لفافہ ملے گا، جسے تمھاری امّی بے تابی سے کھولیں گی۔"

"اللہ تمھاری زبان مُبارک کرے۔ اگر سچ مُچ ابُّو کا خط آ گیا تو لڈّوؤں سے

تمھارا مُنہ بھر دُوں گا۔" لطیف نے کہا
اور خُوشی کے مارے ناچ ناچ اُٹھا۔

"ہمارے مُتعلِق بھی کچُھ کہو۔" سعید نے
کہا۔

"تُم کرکٹ میں بہُت نام پیدا کرو گے۔"
آفاقی نے کہا۔

"ارے۔" سعید نے حیران ہو کر کہا۔
"تُم تو واقعی بہُت بڑے غیب دان ہو۔"

"اچھّا غیب دان صاحب، ہمارے مُتعلِق
کیا حُکم ہے؟" اختر نے پُوچھا۔

"تُم مُجھے جانوروں میں کھیلتے کُودتے
نظر آتے ہو اور پڑھ لِکھ کر جانوروں
ہی کے ڈاکٹر بنو گے۔"

اُس نے اپنی بات ختم کی ہی تھی کہ
کھیل کی گھنٹی بجنا شرُوع ہو گئی۔ لڑکے
اپنی اپنی جگہ سے اُٹھے اور آفاقی سے
کہنے لگے "چلو، چل کر کھیلیں۔"

"ٹھہر جاؤ۔" آفاقی نے خوف زدہ ہو
کر کہا "آج سہ پہر کو کوئی خوف ناک
بات ہونے والی ہے۔ میں اس کی بابت
تمھیں خبردار کر دینا ضروری سمجھتا ہُوں۔
میری آنکھوں کے سامنے ایک دُھندلی سی
تصویر اُبھر رہی ہے۔ میں دیکھ رہا ہُوں
کہ سارا سکُول کھیل کے میدان میں جمع
ہو رہا ہے۔ وہاں سعید بھی ہے، عزیز
بھی ہے اور لطیف اور اختر بھی۔ سب
کھیل دیکھنے میں مگن ہیں۔ کیوں ماسٹر
صاحب، آج سہ پہر کے وقت یہ لوگ کھیل
کے میدان میں جمع ہو رہے ہیں نا؟"

"ہاں میاں۔ آج پڑوس کے ایک قصبے
کی کرکٹ ٹیم سے ہمارا میچ ہو رہا ہے
اور سعید اپنے سکُول کی ٹیم کا کپتان
ہو گا۔" یہ کہہ کر ماسٹر صاحب چلے گئے۔
آفاقی نے بہتیرا زور مارا کہ لڑکے اِس

کی بات سُن لیں مگر سب نے سُنی اَن سُنی کر دی اور اُسے کھینچ کر میدان میں لے آئے۔

میدان میں لڑکے طرح طرح کے کھیل کھیل رہے تھے۔ آفاقی بھی اُن کے ساتھ کھیلنے لگا۔ لڑکے اُس کی مہارت کو دیکھ کر واہ وا کر رہے تھے۔ کرکٹ میں تو اُس نے کمال کر دِکھایا۔ جب گیند اس کی طرف آتی تو وُہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کے نِشانے کا اندازہ کر لیتا اور پھر ایسی کراری ہٹ لگاتا کہ تین چار دوڑیں آرام سے ہو جاتی تھیں۔ سعید اس کے کھیل کو دیکھ کر بے حد خُوش ہُوا۔ وُہ دوڑ کر اُس کے پاس آیا اور کہنے لگا "آج میچ میں تُم ضرور ہمارے ساتھ کھیلنا۔ پھر دیکھنا ہم مُخالف ٹیم کو کس بُری طرح

سے ہراتے ہیں۔ کھیلو گے نا ؟"

"تمھیں کھیل کی پڑی ہے اور میرا خوف کے مارے بُرا حال ہو رہا ہے۔" آفاقی نے کہا "وُہ دیکھو، میری آنکھوں کے سامنے پھر وُہی تصویر اُبھری ہے۔ میدان میں بھگدڑ سی مچی ہُوئی ہے۔ جدھر جس کا سینگ سما رہا ہے، بھاگے جا رہا ہے۔ گھنٹیوں کے شور سے کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ کچھ آدمی اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ اُنھوں نے لوہے کی عجیب سے ہیٹ پہن رکھے ہیں۔ اور ہاتھوں میں لمبی لمبی ربڑ کی نالیاں پکڑے ہُوئے ہیں۔"

سعید نے پھٹی پھٹی نظروں سے آفاقی کو دیکھا اور بولا "یہ کیا کہہ رہے ہو تُم؟ عجیب سے ہیٹ، لمبی لمبی ربڑ کی نالیاں۔ کہیں پاگل تو نہیں

ہو گئے؟"

"تمھیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا۔" آفاقی اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔

"اچھا، تُم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔"

کرکٹ میچ

گاؤں کا سکول ایک پہاڑی کے دامن میں تھا اور جو راستہ پہاڑی کے گرد گھومتا ہوا گاؤں کی طرف آتا تھا اُس کا موڑ بہُت خطرناک تھا۔ اسی موڑ کے قریب سکول کا میدان تھا۔

سہ پہر کے بعد تمام لڑکے میدان میں پہنچ گئے اور مہمان ٹیم کے آنے کا بے چینی سے اِنتظار کرنے لگے۔ اُنھیں آئے ہُوئے کچھ دیر ہی ہُوئی تھی کہ پہاڑی کی چوٹی پر مخالِف ٹیم کے ماسٹر صاحب نظر آئے۔ لڑکوں نے تالیاں بجا بجا کر اُن کا اِستقبال کیا اور جب مہمان ٹیم آ گئی تو

نعروں سے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔

"کپتان سعید، زندہ باد"

مخالف ٹیم کا نعرہ تھا "کپتان سلیم زندہ باد"

ماسٹر حیدر جی نے سب کا جوش ٹھنڈا کیا اور دونوں کپتان ٹاس کرنے لگے۔

"چت ہماری" سعید نے کہا۔

"پٹ ہماری" سلیم نے کہا۔

سکّہ ہوا میں اُچھل کر زمین پر چت گرا۔ جسے دیکھتے ہی سعید نے زور سے کہا "ہپ ہپ ہُرّے"

دونوں ٹیمیں میدان میں آ گئیں۔

اتنے میں آفاقی، اختر اور دُوسرے لڑکوں نے وکٹیں گاڑ دیں اور ہر کھلاڑی اپنی اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ کھیل کے ریفری مہمان ٹیم کے ماسٹر جی مقرر ہُوئے اور کھیل شروع ہو گیا۔

اختر نے بیٹ سنبھالا اور وکٹوں کے پاس آ کر کھڑا ہُوا مگر وُہ کچھ گھبرایا ہُوا سا تھا۔ اُدھر سے زنّاٹے کے ساتھ گیند آئی تو پلک جھپکتے میں وکٹوں کو اُڑا کے لے گئی۔ اختر کا گھبرانا بے معنی نہیں تھا۔ مخالف ٹیم کا بولر اپنے فن کا رُستم تھا اور لوگ اس کی گیند سے بُری طرح لرزتے تھے۔ جب لطیف نے اختر کی جگہ لی تو وُہ بھی پہلے ہی وار میں صاف ہو گیا۔

اس کے بعد داؤد آیا تو وُہ تھوڑی دیر کے لیے ٹک گیا۔ اس پر سارے سکول نے شکر کا کلمہ پڑھا کہ کچھ تو ڈھارس بندھی۔ لیکن پھر جو ٹھا کی زور دار آواز آئی تو داؤد بھی مُنہ لٹکائے واپس آ گیا۔

اس پر سعید تلملا اُٹھا اور کہنے لگا

"اگر یہ کھیل ایسے ہی جاری رہا تو مارے گئے ہم۔"

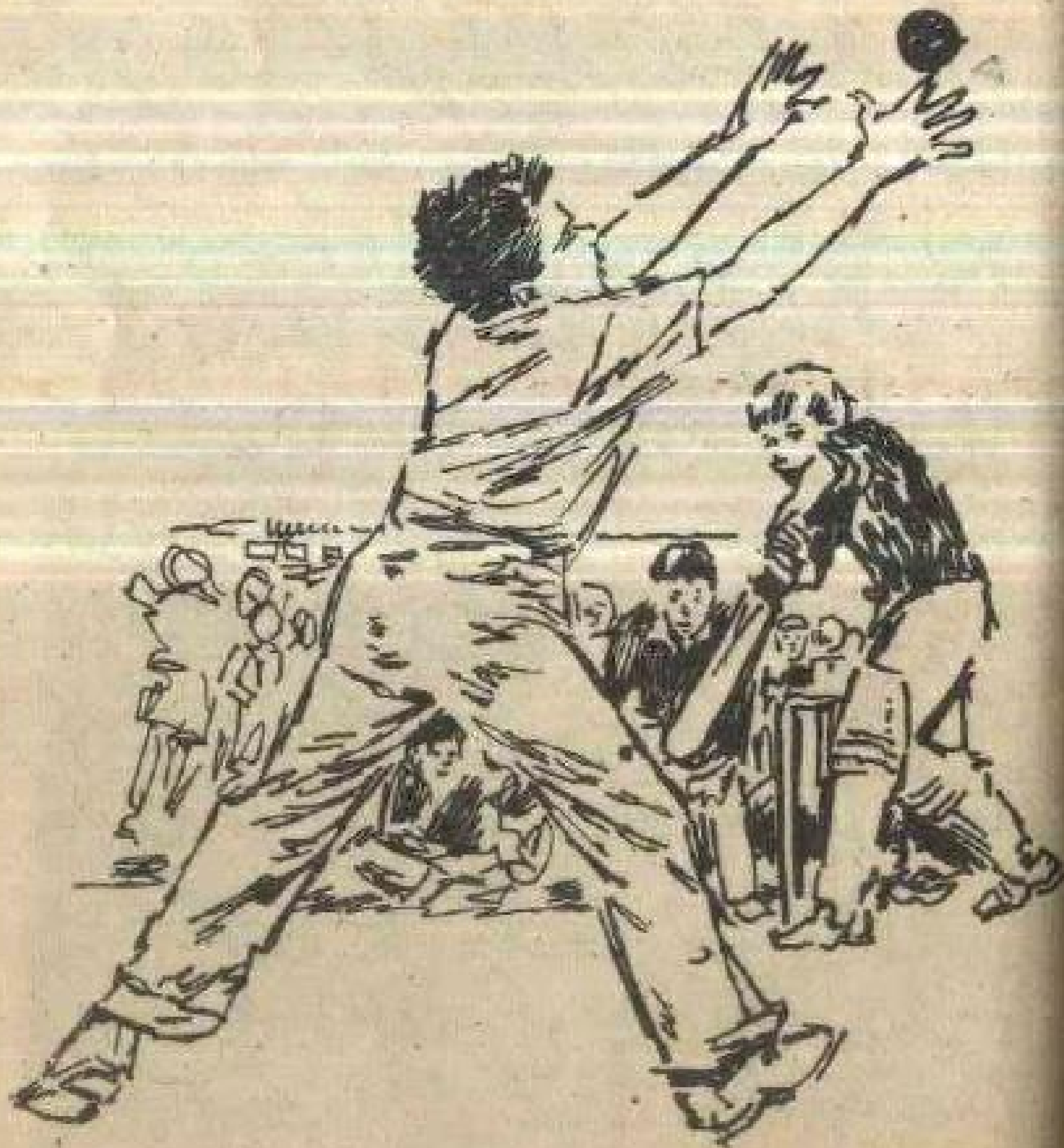
یہ کہہ کر اُس نے بلّا لیا اور میدان میں آ ڈٹا۔ اُس نے تالیوں کی گونج میں ہٹ پر ہٹ لگانی شروع کی اور چند منٹوں میں کھیل کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ چاروں طرف شور مچا ہوا تھا۔ "چھکّا سعید، چھکّا"

لیکن سعید کے ساتھی نے لُٹیا ڈبو دی اور اُس کے کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔ اس نے گیند کو یُوں ہٹ لگائی تھی کہ بولر نے اُسے آسانی سے دبوچ لیا تھا۔

اب آفاقی میدان میں آیا اور بلّا اُٹھا کر وکٹوں کے پاس کھڑا ہو گیا سعید کو اُس سے جتنی اُمّید تھی وُہ اُس سے بڑھ کر ثابت ہُوا۔ کیا بات

تھی اِس کی۔ وُہ زور زور کی ہٹیں لگائیں کہ سکُول کی آنکھوں کا تارا بن گیا اور مُخالف ٹیم کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔

کبھی تو اُس کی گیند جنگلے کے اس



پار جا نکلتی ، کبھی جنگلے کے اِدھر رُک جاتی اور کبھی اِتنی دُور جا اُڑتی کہ پہنچ سے باہر ہو جاتی ۔

جاوید کو اپنے بولر ہونے کا بڑا مان تھا ۔ اُس نے لاکھ زور مارا کہ گیند آفاقی کی وکٹ کو چھو جائے مگر اس کی ساری کاری گری دھری کی دھری رہ گئی ۔ آفاقی عُقاب کی طرح گیند کو تاڑتا تھا اور شیر کی طرح جھپٹ کر اُسے آنکھوں سے اوجھل کر دیتا تھا ۔

دیکھتے ہی دیکھتے سکور بورڈ پر 100 کا ہندسہ اُبھرا اور سارے سکول نے تالیاں بجا بجا کر آسمان سر پر اُٹھا لیا ۔ سعید نے اپنی ٹیم کی اِننگز ختم کرنے کا اِعلان کر دیا ۔

آرام کا وقفہ ختم ہُوا تو سعید کی

ٹیم بولنگ کے لیے آگے بڑھی اور مُخالف ٹیم نے بیٹ سنبھالا ۔ بیٹسمین گیند کا اِنتظار کر رہا تھا کہ آفاقی نے اس پھُرتی سے گیند پھینکی کہ وُہ بجلی کی طرح اُڑی ... اور ٹھا سے وِکٹ اُڑا گئی ۔ بے چارہ بیٹسمین دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا کہ گیند آئی کہاں سے اور گئی کِدھر ؟

یہی حشر دُوسرے کھلاڑی کا ہُوا ۔ اور پھر جو بھی آیا ، ٹھہر نہ سکا ۔ آفاقی نے منٹوں میں سب کو ڈھیر کر دیا ۔ مُخالف ٹیم کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ۔ وُہ بُری طرح ہار چُکی تھی ۔

تالیوں کی گُونج اور نعروں کے شور نے کھیل کے میدان کو ہلا ڈالا ۔

کپتان سلیم بڑے دل گردے کا لڑکا

تھا۔ وہ شور تھمنے پر سعید کو جیت کی
مُبارک دینے آیا اور بولا "بھئی سعید
تُم تو اِس کھیل کے دُولہا ہو ہی مگر
جیت کا سہرا اس لڑکے کے سر ہے۔"
اس نے آفاقی کی طرف اشارہ کیا "اس
غضب کی ہٹ لگاتا ہے اور اِتنی
نپی تُلی گیند پھینکتا ہے کہ آدمی حیران
رہ جاتا ہے۔ اسے پہلے تو میں نے
یہاں کبھی نہیں دیکھا۔ بھئی، آپ کہاں
کے رہنے والے ہیں؟"

"میرے وطن کی کیا پُوچھتے ہو
صاحب۔ لاکھوں میل کا فاصلہ طے
کر کے یہاں آیا ہُوں۔" آفاقی نے
کہا۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ماسٹر
جی بھی آ گئے اور کہنے لگے:

"بھئی آفاقی، اِس جیت کی خُوشی
میں ہم آج تُمھاری شان دار دعوت کر

رہے ہیں۔ مگر ارے، یہ کیا؟ تُمھاری
رنگت اُڑی اُڑی سی کیوں ہے؟ اِتنے
پریشان کیوں ہو رہے ہو؟"

"میرا دِل گھبرا رہا ہے ماسٹر جی،
آپ ذرا اِدھر آئیے۔ مُجھے آپ سے
ایک ضرُوری بات کہنی ہے۔ جلدی کیجیے"
اور جب دونوں بھاگم بھاگ سکُول
کے دروازے پر آ گئے تو آفاقی نے
کہا "ماسٹر جی، آپ نہ تو مُجھ سے
کوئی سوال پُوچھیے اور نہ میری بات
ٹالیے۔ بس جو کہوں، کرتے جائیے۔
معاملہ بے حد نازُک ہے۔ آپ مہربانی
کر کے سب لڑکوں کو فوراً یہاں بُلا
لیجیے۔ فوراً"

ماسٹر جی نے سیٹی بجائی اور ساتھ
ہی زور سے پُکار کر کہا "سب اِدھر
بھاگ آؤ۔ فوراً۔"

لڑکے حیران تھے کہ یہ ماسٹر جی کو کیا ہو گیا ہے ۔ مگر اُن کے حُکم کو بھلا کون ٹال سکتا تھا ۔ وُہ بھگدڑ مچی کہ توبہ بھلی ۔ ایک دُوسرے پر گرتے پڑتے ہانپتے کانپتے سب ان کے پاس آ گئے۔ ماسٹر جی اُنھیں سکُول کے بڑے دروازے کے ساتھ والے کلاس رُوم میں لے آئے جو منٹوں میں کھچا کھچ بھر گیا ۔

اِتنے میں زور زور سے ہارن بجنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی ایک لاری دِکھائی دی جو بے تحاشا ، چکّر کھاتے ہُوئے ، پہاڑی راستے پر دوڑی چلی آ رہی تھی ۔

آفاقی زور سے بولا "کوئی جا کر آگ بُجھانے والوں کو اِطّلاع دے دے ۔" یہ سُنتے ہی مُخالِف ٹیم کے ماسٹر جی باہر کی طرف بھاگے ۔

لاری گرجتی دھاڑتی اُڑتی چلی آ رہی تھی

ڈرائیور ایک ہاتھ باہر نکال کر پُورے زور سے ہلا رہا تھا اور ساتھ ہی چلّاتا بھی جاتا تھا ۔

یہ دیکھ کر سعید بولا "یہ تو پٹرول کی لاری ہے ۔ معلُوم ہوتا ہے ڈرائیور کے قابُو میں نہیں رہی ۔"

لاری آخری موڑ پر آ کر گھُومی تو کھیل کے میدان کے جنگلے کو تہس نہس کرتی ہُوئی بدمست ہاتھی کی طرح درخت سے جا ٹکرائی اور پھر اُلٹ گئی ۔ خُوش قِسمتی سے ڈرائیور ایک ہی جھٹکے میں باہر آ گرا اور قلابازیاں کھاتا ہُوا کہیں کا کہیں جا پہنچا ۔ اسے صحیح سلامت دیکھ کر آفاقی نے سُکھ کر سانس لیا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے لاری میں سے پہلے دُھوئیں کی پتلی سی لکیر اُٹھی اور پھر منٹوں میں بڑے بڑے شُعلے لپک لپک کر آسمان

سے باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد اِس زور کا دھماکا ہُوا جیسے بے شمار بم ایک ساتھ پھٹ پڑے ہوں۔

دھماکے سے سارا سکُول کانپ اُٹھا۔

ابھی اِس ہولناک آگ کو بھڑکتے ہُوئے چند مِنٹ گزُرے تھے کہ آگ بُجھانے والا اِنجن ٹن ٹن کرتا ہُوا آگ والی جگہ پر پہنچ گیا اور اُس میں سے چند آدمی، جِنھوں نے لوہے کی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں، بڑی پھُرتی سے اُترے اور ربڑ کے لمبے لمبے پائپوں سے آگ پر پانی کے فوّارے چھُوٹنے لگے۔ کوئی گھنٹا بھر کی کوشش کے بعد آگ پر قابُو پا لیا گیا۔

جب حالات سُدھر گئے تو مجمع میں خُوشی کی لہر دوڑ گئی اور سعید نے بے اِختیار ہو کر آفاقی کو پُکارنا شروع کر دیا۔

لیکن وہاں آفاقی تھا کہاں جو اُسے جواب دیتا۔ وُہ تو جنگل میں اُسی جگہ جا کر چھُپ گیا تھا جہاں اُڑن طشتری نے اُسے اُتارا تھا۔

رات کے دس بجے پھر اُڑن طشتری آئی۔ اُس نے اسی جگہ سیڑھی لٹکائی اور پلک جھپکتے میں آفاقی اُوپر چڑھ گیا۔ اس کے بعد اُڑن طشتری آسمان کو اپنے نُور میں نہاتی ہُوئی نظروں سے غائب ہو گئی۔

دو دو باتیں

یہ کتاب تو آپ نے پڑھ لی مگر یہ بتائیے کہ آپ کو اُڑن طشتری کا یقین بھی آیا کہ نہیں؟ کیا یہ سچ ہے کہ خلاؤں کے باشندے ہماری دُنیا کی سیر کرنے کے لیے آیا کرتے ہیں؟

اکثر لوگ اِس بات کو مذاق سمجھتے ہیں وُہ کہتے ہیں کہ اُڑن طشتری وہم کے سِوا کُچھ نہیں۔

بعض سائنس داں کہتے ہیں کہ دلدلوں سے اُٹھنے والی گیسیں اُوپر جا کر عجیب عجیب شکلیں اِختیار کر لیتی ہیں۔ ان شکلوں میں سے ایک شکل اُڑن طشتری کی بھی ہے۔

لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنھیں یقین ہے کہ اُڑن طشتری واقعی کوئی چیز ہے، کیوں کہ اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھا ہے۔

16ر اکتوبر 1957ء کو نیو میکسی کو (امریکہ) میں ایک اُڑن طشتری پندرہ منٹ تک دِکھائی دیتی رہی تھی۔ اور بہت سے لوگوں نے اس کی فوٹو بھی اُتاری تھی جو دُنیا بھر کے اخباروں میں شائع ہوئی تھی۔

امریکہ کے بہت سے پائلٹ اِس بات کی تائید کرتے ہیں کہ خلا میں عجیب عجیب چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ آج کل دُنیا بھر کے سائنس داں اُڑن طشتری کی بابت تحقیق کر رہے ہیں اور وُہ دِن دُور نہیں جب وُہ یہ بات ثابت کر دِکھائیں گے کہ اُڑن طشتری وہم نہیں

سچ مچ ہوائی جہاز کی طرح کی ایک چیز ہے۔
یہ سچ ہے کہ اس کتاب میں ایک
خیالی کہانی بیان کی گئی ہے، مگر یاد
رکھیے، عمل ہمیشہ خیال کے پیچھے پیچھے
آیا کرتا ہے۔
پرانے زمانے کے کہانیاں لکھنے والوں
نے کبھی انسان کے پر لگائے اور کبھی
اُسے اُڑن کھٹولے میں بٹھایا اور اپنے
خیال کے زور سے اُسے چاند پر پہنچا
دیا۔ اب اسی خیال کو سائنس والوں نے
عمل میں ڈھال دیا اور ایسا راکٹ بنایا
جس میں بیٹھ کر انسان سچ مچ چاند
پر پہنچ گیا۔

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر